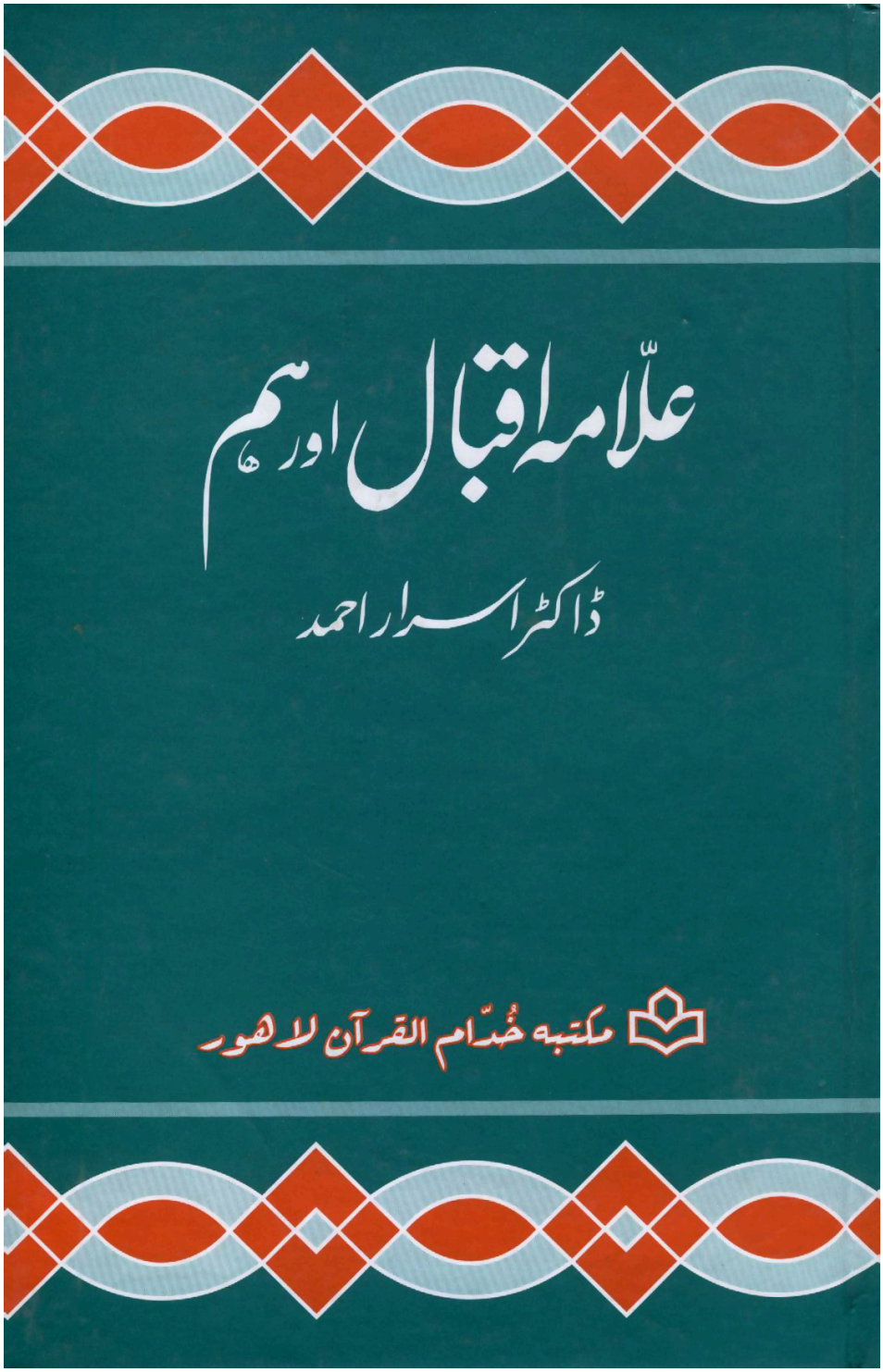

علامہ اقبال اور ہم

ڈاکٹر اسرار احمد

علامہ اقبال اور ہم

ڈاکٹر اسرار احمد
پروفیسر یوسف سلیم چشتی
سید نذیر نیازی

مشمولات

علّامہ اقبال اور ہم (ص۷)
فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ
اور ہماری ذمہ داریاں (ص۴۱)
ڈاکٹر اسرار احمد
حیات و سیرت اقبال (ص۶۹)
فلسفۂ اقبال (ص۷۷)
اور
ملّتِ اسلامیہ کے نام علّامہ اقبال کا پیغام (ص۸۹)
پروفیسر یوسف سلیم چشتی
اقبال اور قرآن (ص۱۱۷)
سیّد نذیر نیازی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

آج سے لگ بھگ ۲۱ سال قبل ۳ / مئی ۷۴ء کو ایچی سن کالج لاہور میں علامہ اقبال مرحوم کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جس کے مرکزی مقرر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تھے۔ یہ ایک یادگار خطاب تھا جس میں محترم ڈاکٹر صاحب نے نہایت منفرد انداز میں مسلمانانِ پاکستان اور علامہ اقبال کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب نے واضح کیا کہ اقبال بلاشبہ مصور و مجوز پاکستان تو تھے ہی، وہ قافلۂ ملی کے ایک عظیم حدی خواں اور ایک بلند پایہ "ترجمان القرآن" بھی تھے۔ اس اعتبار سے پاکستان میں بسنے والا ہر مسلمان نہ صرف یہ کہ علامہ اقبال کے ساتھ ایک سہ گونہ رشتے میں منسلک ہے بلکہ وہ تین جہات سے اقبال کے زیر بارِ احسان بھی ہے اس فکر انگیز خطاب کو بعد میں مرتب کرکے "علامہ اقبال اور ہم" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

علامہ مرحوم کے ساتھ محترم ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کا اہم ترین سبب علامہ کا فکرِ قرآنی ہے۔ انہوں نے افکارِ قرآنی کو اپنے اشعار میں جس طرح سمویا وہ انہی کا حصہ ہے۔ سب جانتے ہیں علامہ نے اپنی شاعری کے ذریعے

قوم کو ایک پیغام دیا اور جسدِ ملی میں ایک نئی روح پھونکی، لیکن اس بات سے شاید بہت کم لوگ واقف ہوں کہ اقبال در حقیقت ترجمانِ قرآن تھے، ان کا پیغام بھی تمام تر افکارِ قرآنی ہی سے عبارت ہے۔ چنانچہ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اپنے پر تاثیر کلام کے ذریعے مسلمانانِ برصغیر کو قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات کی جانب متوجہ کرنا، انہیں قرآن کے انقلابی فکر سے روشناس کرانا اور اس طرح اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کرنا فی الاصل اقبال کے پیش نظر تھا۔ اسی حقیقت کا نہایت شدت کے ساتھ انکشاف محترم ڈاکٹر صاحب پر بھی ہوا کہ کرنے کا اصل کام یہی ہے۔ چنانچہ وہ اس معاملے میں علامہ مرحوم کو بجا طور پر اپنا پیش رو قرار دیتے ہیں اور ان کی عظمت کے واشگاف الفاظ میں اظہار و اعتراف میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے نزدیک دورِ حاضر میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید میں سب سے بڑا حصہ علامہ اقبال کا ہے۔ مسلمان بحیثیتِ مجموعی اس اہم حقیقت کو فراموش کر چکے تھے کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں، دین ہے جو پورے نظام اجتماعی پر اپنا غلبہ و اقتدار چاہتا ہے۔ اقوامِ مغرب کی غلامی نے انہیں اس درجے پست ہمت اور کوتاہ فکر بنا دیا تھا کہ وہ اپنے ذاتی نماز روزے پر ہی قانع ہو کر رہ گئے تھے اور اسی کو کل اسلام سمجھ بیٹھے تھے۔ "تکبیرِ رب" جیسے ولولہ انگیز انقلابی تصور کو

مسلمان نے تسبیح و وظائف تک محدود کر دیا تھا۔ اقبال نے بڑے زوردار انداز میں دین و مذہب کے اس محدود تصور پر ضرب لگائی اور نہایت دلنشیں پیرائے میں دین کے اصل تصور کو اجاگر کیا:

یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
یہ مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات

فکرِ اقبال کے ان گوشوں سے محترم ڈاکٹر صاحب کو خصوصی دلچسپی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں کسی فورم سے اقبال کے موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی انہوں نے خوش دلی کے ساتھ اس دعوت کو قبول کیا۔ مرکزیہ مجلس اقبال لاہور کے زیر اہتمام یوم اقبال کی تقریب میں متعدد بار وہ مہمان مقرر کی حیثیت سے خطاب کر چکے ہیں۔۔۔ اس ضمن میں ۲۱ اپریل ۸۶ء کو الحمرا ہال میں یومِ اقبال کی تقریب میں "فکرِ اقبال کی روشنی میں، حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ داریاں" کے عنوان سے انہوں نے ایک مبسوط مقالہ تحریری شکل میں پیش کیا تھا جو بعد میں میثاق میں بھی شائع ہوا۔ اس فکر انگیز مقالے کو بھی زیر نظر کتاب کے اس تازہ ایڈیشن میں شامل کر لیا گیا ہے۔

بات نامکمل رہے گی اگر "فکر اسلامی کی تجدید اور علامہ اقبال اور فکرِ اقبال کی تعمیل کا تاریخی جائزہ" کے عنوان سے محترم ڈاکٹر صاحب کی ان دو تحریروں کا ذکر نہ کیا جائے جو اب ان کی کتاب "بر عظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل کی مستقل جزو ہیں۔ بحیثیتِ مجددِ فکرِ اسلامی اقبال کا کردار ان تحریروں کے ذریعے زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ یہ تحریریں اولاً اخباری کالموں کی صورت میں ۹۲ء کے نصفِ آخر میں روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوئیں اور پھر مذکورہ بالا کتاب کا حصہ بن گئیں۔ علامہ اقبال کے بارے میں محترم ڈاکٹر صاحب کے خیالات کو پورے طور پر جاننے کے لیے ضروری ہوگا کہ زیر نظر کتاب کے ساتھ ساتھ ان تحریروں کو بھی نظر سے گزار لیا جائے۔ ان مقالات و مضامین کے مابین جن کا اوپر ذکر کیا گیا، اگرچہ اچھا خاصا زمانہ فصل اور بعد موجود ہے کہ پہلا مضمون "علامہ اقبال اور ہم" ۷۴ء کا مرتب کردہ، دوسرا مقالہ "فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائز" اس کے ۱۲ سال بعد ۸۶ء کا تحریر کردہ ہے اور ان حالیہ تحریروں کی تسوید جن کا اوپر حوالہ دیا گیا، مزید ۶ سال بعد یعنی ۱۹۹۲ء کے اواخر میں ہوئی، لیکن آپ دیکھیں گے کہ ان تمام مضامین و مقالات میں فکری اعتبار سے کوئی تناقض و تباین نہیں ہے، بلکہ ایک واضح فکری تسلسل موجود ہے جو بلاشبہ ایک نہایت قابل قدر بات ہے!

علاوہ ازیں زیرِ نظر کتاب میں شارح کلامِ اقبال پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کے بعض نہایت وقیع مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں کہ جن کے ذریعے اقبال کی شخصیت، ان کا فلسفۂ خودی

اور ملتِ اسلامیہ کے نام اقبال کےپیغام کا ایک جائزہ نہایت جامعیت اور عمدگی کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔ ان مضامین سے متعلق خاص بات یہ ہے کہ ۱۹۳۳ میں اس وقت سپردِ قلم کیے گئے جب علامہ اقبال مرحوم ابھی بقیدِ حیات تھے۔ چشتی صاحب مرحوم ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جنہیں ایک طویل عرصے تک علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضری کا مسلسل موقع ملتا رہا۔ لہٰذا اقبال اور افکارِ اقبال کے بارے میں چشتی صاحب مرحوم کے مضامین غیر معمولی اہمیت و وقعت کے حامل ہیں۔ یہ مضامین "یثاق" کی پرانی فائلوں میں دبے ہوئے تھے، زیر نظر کتاب میں انہیں اس خیال سے شامل کیا جا رہا ہے کہ یہ قیمتی علمی مضامین ضائع ہونے سے بچ جائیں اور لوگوں کے لیے ان سے استفادہ کرنا بسہولت ممکن ہوسکے! ۔۔۔ علامہ سے قرب رکھنے والے ان کے ایک اور ارادت مند جناب سید نذیر نیازی مرحوم کا وقیع مضمون "اقبال اور قرآن" بھی اسی غرض سے شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب کا یہ تازہ ایڈیشن اپنے حجم کے لحاظ سے پہلے کے مقابلے میں کم و بیش تین گنا ضخامت کا حامل ہے۔

یادش بخیر، چند سال قبل ایران کے مشہور مفکر و دانشور ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم کی اقبال کے موضوع پر ایک کتاب نظر سے گزری۔ ڈاکٹر شریعتی کے بارے میں یہ بات اکثر احباب کے علم میں ہوگی کہ ایران کے حالیہ انقلاب کے لیے فکری و نظری غذا انہوں نے ہی فراہم کی تھی۔ ان کے انقلابی افکار جو مختصر کتابچوں کی صورت میں

نہایت سرعت کے ساتھ ایران کے طول و عرض میں پھیلے، انقلابِ ایران کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اقبال کے فارسی کلام اور فلسفہ و فکر سے شدید طور پر متاثر تھے اور خود انہوں نے بہت کچھ فکری غذا اقبال سے حاصل کی تھی۔ حسنِ اتفاق سے اقبال اور اس کے افکار پر انہوں نے جو کتاب مرتب کی اس کا نام بھی بعینہ وہی رکھا جو محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے لیے ۱۹۷۷ء میں تجویز کیا تھا، یعنی "ما و اقبال"۔ جس کا سیدھا سا ترجمہ یہی بنتا ہے: ہم اور علامہ اقبال!۔۔

ناظم نشر و اشاعت
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۱۴ جولائی ۹۵ء

6

علامہ اقبال مرحوم اور ہم

اسرار احمد

ایک تقریر جو ۳ مئی ۱۹۷۴ء کو ایچی سن کالج لاہور میں ایک اجتماع منعقدہ بیاد علّامہ اقبال مرحوم میں زیرِ صدارت پروفیسر اشفاق علی خان کی گئی

7

علامہ اقبال مرحوم اور ہم

اسرار احمد

ایک تقریر جو ۳ مئی ۱۹۷۴ء کو ایچی سن کالج لاہور میں ایک اجتماع منعقدہ بیاد علّامہ اقبال مرحوم میں زیرِ صدارت پروفیسر اشفاق علی خان کی گئی

8

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خطبۂ مسنونہ اور دعا کے بعد:

صدر گرامی قدر، مہمانان گرامی، محترم پرنسپل صاحب، اساتذۂ کرام اور عزیز طلبہ!

اگرچہ پاکستان کی اس مشہور درس گاہ میں اس سے قبل متعدّد بار خطاب کا موقع مل چکا ہے تاہم مجھے شدید احساس ہے کہ آج کے اس اجلاس سے جو بیاد علّامہ اقبال مرحوم منعقد ہورہا ہے، میرا خطاب کرنا ایک غیر معمولی جرأت ہی نہیں کسی قدر نامناسب جسارت بھی ہے۔

اس کا سبب بالکل واضح ہے یعنی یہ کہ میں نہ زبان و ادب کے میدان کا آدمی ہوں نہ فکر و فلسفے کا، بلکہ میری بنیادی تعلیم سائنس کی ہے اور ثانوی تربیت طبّ و علاج کی۔ جبکہ علاّامہ اقبال کی دو سب سے زیادہ معروف حیثیتیں یہی ہیں کہ وہ ایک بہت بڑے شاعر بھی ہیں اور ایک عظیم فلسفی اور مفکر بھی۔ لہٰذا علامہ مرحوم کے بارے میں میری تقریر کچھ انمل بے جوڑ سی بات ہے۔ بایں ہمہ، جب مجھے اس تقریب میں حاضر ہوکر اظہار خیال کی دعوت دی گئی تو میں نے بغیر کسی پس وپیش یا ردّ و قدح کے فوراً آمادگی ظاہر کردی۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ میرے نزدیک پاکستان میں بسنے والا ہر مسلمان، قطع نظر اس سے کہ وہ عوام میں سے ہو یا خواص میں سے اور بالکل ان پڑھ اور جاہل ہو یا عالم و فاضل، علامہ مرحوم کے ساتھ سہ گانہ و سہ گونہ رشتوں میں منسلک ہے:

ایک یہ کہ یہ مملکتِ خداداد سرزمین پاکستان جس میں ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے اقامت گزیں ہیں، اس کا وجود و قیام علامہ مرحوم ہی کے تخیل و تصور کا رہینِ منت ہے۔

9

دوسرے یہ کہ وہ عالمی ملت اسلامی اور امت مرحومہ جس سے ہم سب منسلک ہیں، اس دور میں اس کی عظمت و سطوتِ پارینہ کا سب سے بڑا مرثیہ خواں بھی اقبال ہے اور اس کے اِحیاء و نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا حدی خواں بھی اقبالؔ ہی ہے۔ تیسرے یہ وہ دینِ حق جس کے ہم سب نام لیوا ہیں اور جس کے بارے میں کچھ ہی پہلے حالی مرحوم نے کہا تھا:

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے !
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

اس دور میں خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اس کے اسرار و رموز کا سب سے بڑا رازدان بھی اقبالؔ ہی ہے اور اس کی روحِ باطنی اور جسدِ ظاہری دونوں کے تجدید و احیاء کے عظیم ترین نقیب کی حیثیّت بھی اقبالؔ ہی کو حاصل ہے !

یہ سہ گانہ تعلق تو علّامہ مرحوم کے ساتھ ہر پاکستانی مسلمان کو حاصل ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایک چوتھی خصوصی نسبت روحِ اقبالؔ سے یہ ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے یہ حقیقت مجھ پر شدّت کے ساتھ منکشف ہوچکی ہے کہ احیائے اسلام کی شرطِ لازم تجدید ایمان ہے اور ایمان کا اصل منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ گویا ملت اسلامی کی نشاۃ ثانیہ اور تشکیل جدید کی کوشش ہو یا احیائے اسلام اور غلبۂ دینِ حق کی جدو جہد، دونوں کا اصل مبنیٰ و مدار اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کا قرآن حکیم کے ساتھ صحیح تعلق دوبارہ استوار کیا جائے اور اس حقیقی نسبت کی تجدید کی کوشش کی جائے جو ایک مسلمان اور قرآن کے مابین ہونی چاہیے اور میں دیکھتا ہوں کہ ملت اسلامی اور دینِ حق دونوں کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کے اس طرح قرآن حکیم کے ساتھ وابستہ ہونے کا احساس اسی قدر بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدّت کے ساتھ علامہ مرحوم کو تھا۔ "یغفر اللہ لہ و یرحمہ"

خلاصۂ کلام یہ کہ ۔۔۔ میں نہ علامہ مرحوم کی شاعری اور ان کی فصاحت و بلاغت یا قدرتِ کلام کے بارے میں کسی ماہر فن ناقد کی حیثیت سے کچھ عرض کرنے کا مجاز ہوں۔۔۔ نہ ان کے فکر و فلسفے پر خالص فلسفیانہ انداز میں کوئی تبصرہ کرسکتا ہوں۔۔۔ بلکہ میں مذکورہ بالا چار نسبتوں ہی کے بارے میں کچھ مختصراً عرض کروں گا:

----------(۱)----------
مصوّرِ پاکستان

سب جانتے ہیں کہ علامہ مرحوم بنیادی طور پر سیاست دان نہ تھے، بلکہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی وہ اپنے مزاج کو عملی سیاست کے ساتھ سازگار نہ بنا سکے۔ اس کے باوجود انہوں نے برّصغیر ہندوپاک کی مسلمان قوم کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ سوچا اور ان کے مسائل کا جو حل پیش کیا وہ ان کی بیدار مغزی اور معاملہ فہمی بلکہ کہنا چاہیے کہ سیاسی تدبّر کا شاہکار ہے۔ ۱۹۳۰ء سے قبل تو سوال ہی کیا پیدا ہوسکتا ہے، اس کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک ہندوستان کی تقسیم کا خیال تک کسی کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ یہ صرف علامہ مرحوم ہی کی نگاہِ دور رس و دور بین تھی جس نے حالات کے رخ اور زمانے کی رفتار کو پہچان کر مسلمانانِ ہند کے جملہ مسائل کا حل اسے قرار دیا کہ ہندوستان کے کم از کم شمال مغربی گوشے میں واقع مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کی ایک آزاد اور خود مختار مملکت قائم کی جائے! ؎

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

پاکستان کے ساتھ علامہ کا تعلق صرف مصور کا نہیں اس سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ اگرچہ خود عملی سیاست کے مردِ میدان نہ تھے، تاہم حالات کی صحیح نبّاضی اور ان کی سیاسی بصیرت کا دوسرا شاہکار یہ ہے کہ انہوں نے موجود الوقت حالات میں مسلمانانِ ہند کے قومی مقدمے کی پیروی کے لیے صحیح ترین وکیل ڈھونڈ نکالا اور نہ صرف یہ کہ ان کی نگاہ دور رس نے مسلمانانِ ہند کی قیادتِ عظمیٰ کے لیے محمد علی جناح مرحوم کو تاکا بلکہ خود ان میں اپنی اس حیثیت کا احساس اجاگر کیا۔ اور یہ تو بلاشبہ علامہ مرحوم کے غایتِ خلوص و اخلاص کا بیّن ثبوت اور ان کے حد درجہ انکسار اور تواضع کی دلیلِ قاطع ہے کہ انہوں نے اس قائد کے ساتھ اس کی تنظیم کے ایک صوبائی صدر کی حیثیت سے کام کرنا بھی منظور کرلیا حالانکہ ان کے مزاج کو اس قسم کے کاموں کے ساتھ کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔ اس طرح علامہ مرحوم نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کا تصور پیش کیا بلکہ اس خاکے میں رنگ بھرنے کی عملی

جدّوجہد کے ابتدائی مراحل میں بنفسِ نفیس شرکت بھی کی اور گویا 'تحریکِ پاکستان' کے کارکنوں کی فہرست میں شامل ہوگئے۔

اس اعتبار سے علامہ مرحوم کا ایک عظیم احسان ہر اس مسلمان کی گردن پر ہے جو پاکستان کی فضا میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے سانس لے رہا ہے۔ افسوس کہ ہم نے بحیثیت قوم خود پاکستان ہی کی قدر نہ کی، علامہ کے احسان کو کیا یاد رکھتے۔ کاش کہ لوگوں کو معلوم ہوتا کہ آزادی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اور یہ مملکتِ

خداداد پاکستان اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے۔ اسی صورت میں ہمیں علامہ مرحوم کے ذاتی احسان کا بھی کوئی احساس ہوسکتا تھا۔

ہماری اسی ناقدری کا نتیجہ ہے کہ پاکستان کا ایک بازو نہ صرف یہ کہ کٹ کر علیحدہ ہوگیا بلکہ کم از کم فوری طور پر اس کی کامل قلبِ ماہیت بھی ہوگئی اور اس نے ایک اسلامی یا اس سے بھی کمتر درجے میں ایک مسلمان مملکت کے بجائے ایک لادینی، قومی، سوشلسٹ ریاست کا روپ دھار لیا۔ اس حادثۂ فاجعہ پر بھارت میں جس طرح خوشی منائی گئی اور اسے جس طرح ''ہزار سالہ شکست کے انتقام'' سے تعبیر کیا گیا اس سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو ہندوؤں کے بارے میں کسی حسنِ ظن میں مبتلا تھے۔ اگر مسز اندرا گاندھی اس نہرو خاندان کی بیٹی ہوتے ہوئے جس کی وسیع المشربی ضرب المثل ہے، یہ الفاظ زبان سے نکال سکتی ہے تو ''قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا!'' کے مصداق سوچنے کی بات ہے کہ فرقہ پرست متعصّب مزاج ہندو اکثریت کا رویہ، اگر اسے ایک بار ہندوستان میں فیصلہ کن اقتدار حاصل ہوجاتا، تو کیا ہوتا!

حقیقت یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان قائم نہ ہوا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اب تک ہندوستان سے اسلام کا صفایا ہوچکا ہوتا بلکہ پورا مشرق وسطیٰ ہندو امپریلزم کے سیلاب کی زد میں ہوتا۔

علامہ مرحوم نے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالی کے بارے میں فرمایا تھا: ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

تو اگرچہ شخصاً تو علامہ مرحوم کا کوئی مقابلہ یا موازانہ حضرتِ مجدد رحمہ اللہ تعالی کے ساتھ خارج از بحث ہے، تاہم اگر یہ کہاجائے کہ خاص طور پر ''ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی'' کے اعتبار سے علامہ مرحوم کو ایک

نسبِ خصوصی حضرت مجدد کے ساتھ حاصل تھی یا یہ کہ علامہ مرحوم کی شخصیت کا یہ پہلو حضرت مجدد کے ساتھ ان کی والہانہ محبت اور عقیدت ہی کا مظہر ہے تو غالباً یہ غلط نہ ہوگا۔

---------(۲)---------

قافلۂ ملی کا حدی خواں

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کے پیش نظر یہ بات بڑی ہی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانانِ ہند کے قومی مسائل کا ذکر علامہ مرحوم کے اشعار میں کہیں موجود نہیں ہے اور اپنے اشعار میں وہ عالمی ملتِ اسلامیہ کے نقیب اور قافلۂ ملی کے حدی خواں نظر آتے ہیں۔

علامہ مرحوم کی شاعری کے دورِ اوّل میں، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، نہ صرف یہ کہ ان کا جذبۂ حب الوطنی چھلکا پڑتا ہے بلکہ باقاعدہ ہندی قوم پرستی کے آثار بھی ملتے ہیں۔ لیکن ''بانگ درا'' ہی کے نصفِ آخر میں دفعۃً وہ عالمی ملت اسلامیہ کے ترجمان و حدی خواں کی حیثیت سے نمودار ہوجاتے ہیں اور ''ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا'' اور ''میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے'' کی جگہ ''چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا، مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کا وجد آفریں ترانہ ان کی زبان پر جاری ہوجاتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے مابین ہندوستان کے مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کا مسئلہ جو ان کے سیاسی فکر کا مرکز و محور ہے، ان کے اشعار میں کہیں نظر نہیں آتا۔

میرے نزدیک یہ تصوّر پسندی (IDEALISM) اور حقیقت بینی (REALISM) کا حسین ترین امتزاج ہے جس سے ہمیں علامہ مرحوم کی شخصیت متصف نظر آتی ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ یہ "اَصْلُهَا ثَابِتٌ" اور "فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ"(۱) کی عمدہ مثال ہے کہ ایک جانب فکر اور خیال انتہائی بلندیوں کو چھو رہے ہوں اور دوسری طرف انسان کا تعلق اپنے نزدیکی ماحول کے تلخ حقائق سے بھی منقطع نہ ہونے پائے۔ _____ سورۂ ابراہیم کی ایک تمثیل سے ماخوذ: ترجمہ: ''اس کی جڑ جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں!''

علامہ مرحوم کی ملی شاعری میں، جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا تھا، دونوں رنگ موجود ہیں، مرثیہ خوانی کا بھی اور حدی خوانی کا بھی۔۔۔۔ پہلے اعتبار سے یوں سمجھیے کہ انہوں نے شبلی و حالی دونوں کی جانشینی کا فرض ادا کیا اور ملت اسلامیہ کے شاندار اور تابناک ماضی کی یاد سے بھی دلوں کو گداز کیا اور امّتِ مرحومہ کی موجودہ زبوں حالی کا نقشہ بھی نہایت مؤثر اور دلدوز انداز میں کھینچا۔ مثال کے طور پر حالی کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے: ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
انے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اور پھر پڑھیے وہ نظم جو ''صقلیہ'' (جزیرۂ سسلی) پر علامہ مرحوم نے کہی اور اندازہ کیجیے اقبال کی ملی مرثیہ خوانی کا !

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂخونناب بار !
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور
مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیرِ توہّم سے ہوا
غلغلوں سے جس کے لذّت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

یا پڑھیے بانگِ درا میں اس کے قریب ہی کی وہ نظم جو ''بلادِ اسلامیہ'' کی یاد میں کہی گئی۔ اور جس میں دلّی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ ایسے عروس ہائے بلاد میں سے ایک ایک کا نام لے لے کر انتہائی رقت انگیز پیرائے میں امّت مسلمہ کی عظمتِ گزشتہ و سطوتِ پارینہ کا مرثیہ پڑھا گیا۔

یا پڑھیے علامہ اقبال کی وہ طویل نظم جو ''مسجدِ قرطبہ'' کے عنوان سے 'بالِ جبریل' میں شامل ہے۔ اس میں فکر و خیال کی عام بلند پروازی کے علاوہ جذبۂ ملی کی جو بے قرار از ابتدا تا انتہا جاری و ساری

ہے اس سے بھی قطعِ نظر صرف وہ اشعار پڑھیے جو براہِ راست مسجدِ قرطبہ سے مخاطب ہو کر کہے گئے ہیں، اور اندازہ کیجئے جذباتِ ملی کے اس طوفان کا جو اس ''کافرِ ہندی'' کے قلب میں موجزن تھا ! ! اور غور کیجیے اس کے دو آخری بندوں پر کہ کس خوبصورتی کے ساتھ امت مرحومہ کی تجدید و احیاء کا پیغام دیا گیا اور کیسے جذبہ پرور انداز میں ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی دعوت دی گئی۔

اور یہی در اصل علامہ مرحوم کی ملی شاعری کا وہ مثبت اور تعمیری پہلو ہے جو انہیں ملت کے سابق مرثیہ خوانوں سے ممتاز اور ممیز کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ علامہ کے یہاں صرف درد انگیز نالے ہی نہیں ہیں انتہائی ولولہ انگیز پیغام عمل بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک شاندار مستقبل کی خوشخبری بھی ہے جس نے یاس اور قنوطیت کی ظلمت کا پردہ چاک کر دیا اور دلوں میں امید کے چراغ روشن کر دیے۔

یوں تو علامہ کے اشعار میں یہ امید افزا پیغام گویا رچا بسا ہوا ہے، چنانچہ بانگِ درا کے متوسط حصے میں بھی جا بجا یہ رنگ موجود ہے کہ: ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

اور ؎

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

لیکن خاص طور پر ''طلوعِ اسلام'' تو گیا از اول تا آخر ایک 'طبلِ رحیل' ہے:۔

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!
نواپیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!

اور ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

علامہ مرحوم کی یہ ملی شاعری، جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں، حدودِ ارضی سے بالکل آزاد ہے اور ان کے اشعار کو پڑھتے ہوئے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ ان کا قائل کبھی ایک محدود خطّۂ ارضی میں بسنے والے مسلمانوں کے خصوصی مسائل کے بارے میں بھی غور کرتا ہوگا۔ گویا ان کی شاعری ''وَ لٰکِنَّہٗ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ'' (۱) کے ہر شائبے سے بالکل پاک ہے۔ اندازہ کیجیے کہ ایک ہندی مسلمان ارضِ لاہور میں بیٹھا کہہ رہا ہے کہ:۔

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

لیکن دوسری طرف اپنے گردوپیش سے بھی بے خبر نہیں ہے بلکہ حالات کی نبض پر ہاتھ دھرے مسلمانانِ ہند کے مسائل کی تشخیص بھی کر رہا ہے اور ان کا حل بھی پیش کر رہا ہے!
ملت اسلامیہ کی تجدید اور امّت مرحومہ کی نشاۃ ثانیہ کی جو فوری امید علامہ کو تھی، محسوس ہوتا ہے کہ عمر کے آخری دور

میں اسے بہت سے صدموں سے دو چار ہونا پڑا اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بعد میں ایک قسم کی نا امیدی اور یاس کی سی کیفیت بھی علامہ مرحوم پر طاری ہوگئی تھی، جو مثلاً اس قسم کے اشعار سے ظاہر ہے کہ :۔ ؎

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

اور _____

(۱) سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۷۶ کا ایک ٹکڑا۔ ترجمہ: ''لیکن وہ تو زمین کی جانب ہی جھکتا چلا گیا''
(۲) یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت طہران کی بجائے ارضِ لاہور کو عطا فرما دی جہاں ملتِ اسلامیہ کا یہ حدی خواں مدفون ہے۔ ابھی جو عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی اس کے موقع پر جناب وقار انبالوی نے علامہ مرحوم کی روح سے خطاب کرکے کیا خوب کہا ؎

اے دیدۂ بیدارِ خودی ! مردِ قلندر ! رحمت ہے خدا کی ترے افکارِ مبیں پر
لاہورؔ بنا ہے تری ملت کا جنیوا کیا رنگِ بہاراں ہے گلستانِ یقیں پر
تعبیر سے ہم دوش ہے اقبال ترا خواب مسرور ہو تو خلد میں جمعیتِ دیں پر

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج، دیکھ چکا صدف صدف !

لیکن اس کا اصل سبب یہ ہے کہ علامہ مرحوم نابغہ (GENIUS) اشخاص میں سے تھے، جن کے بارے میں یہ مسلم ہے کہ وہ وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ اپنے زمانے سے قدرے بعد کی باتیں کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقویم میں تیس چالیس سال کا عرصہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ علامہ مرحوم نے جس دور کا خواب دیکھا تھا اس کی ابتدا ہو رہی ہے۔(۱) _____ (۱) (پ۔ ن۔ نومبر ۹۴ء) یہ بات راقم نے ۳ مئی ۱۹۷۳ء کو کہی تھی اور بحمد اللہ ایک سال سے کم مدت کے اندر اندر اس کی دو عظیم شہادتیں بھی رونما ہوگئی تھیں۔ چنانچہ ایک طرف اکتوبر ۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں ایک بالکل نیا نقشہ

دنیا کی نگاہوں کے سامنے آگیا تھا۔ چنانچہ وہی عرب جو بزدل اور بھگوڑے مشہور ہوگئے تھے، ان کی بہادری، جرأت اور جانبازی کے چرچے عام ہوگئے اور وہ عالم عرب جس کا اختلاف وافتراق ضرب المثل بن چکا تھا دفعۃً ایک متحد قوت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ یہاں تک کہ یہ ''کنجشکِ فروماویہ'' تیل کا ہتھیار استعمال کرکے امریکہ ایسے ''شاہین'' سے لڑگیا ! دوسری طرف فروری ۷۴ء کی عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس منعقدہ لاہور نے عالمِ اسلام کے اتحاد کا ایک نہایت دلفزا منظر چشم عالم کے سامنے پیش کردیا جس کی اہمیت کا اصل اندازہ اس سراسیمگی سے لگایا جا سکتا ہے جو اس وقت بھارت اور اس کے کارپردازوں پر طاری ہوگئی تھی۔

یہ دوسری بات ہے کہ علامہ اقبال ہی کے ان اشعار کے مصداق کہ ؎ دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش۔ تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا !۔ اور ''اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ۔ ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا !''۔ دنیا کی ابلیسی قوتوں نے احیاء دین و ملت کی اس چڑھتی لہر کو نہ صرف روک دیا بلکہ پسپائی پر مجبور کردیا۔ تاہم اس کے بعد سے اب تک یہ لہر اتار اور چڑھاؤ کے کئی ادوار سے گزر کر بہرحال اس حد تک آگے بڑھ آئی ہے کہ پوری مغربی دنیاء مسلم فنڈامنٹلزم سے خائف نظر آتی ہے۔ اور اگرچہ ابھی احیاء دین و ملت کا یہ عمل مستقبل قریب میں بعض بڑے بڑے صدمات سے دو چار نظر آتا ہے تاہم بالآخر جو نوید جانفزا اقبال نے دی تھی وہ الفاظ قرآنی ''لترکبن طبقاً عن طبق'' اور احادیثِ نبویہ میں وارد شدہ پیشنگوئیوں کے مطابق لازماً پوری ہوکر رہے گی۔ اور ۔ ع۔ ''بتا رہی ہے یہ ظلمت شب کہ صبح نزدیک آرہی ہے'' کے مصداق حوادث و واقعات عالم کی تیز رفتاری بتا رہی ہے کہ بالآخر پورے کرۂ ارضی پر ''خلافت علی منہاج النبوت'' کے نظام کا قیام اب بہت زیادہ دور نہیں ہے !

(اسرار احمد ۸ نومبر ۹۴ء)

-------(۳)---------

رُومیٔ ثانی

جہاں تک دینِ حق کے اسرار و رموز اور حقائق و معارفِ ایمانی اور علم و حکمتِ قرآنی کی ترجمانی کا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم رومیٔ ثانی تھے ! انہوں نے علی الاعلان مولانا روم کو اپنا شیخ تسلیم کیا ہے اور ''پیرِ رومی'' کے ساتھ بحیثیت ''مریدِ ہندی'' ان کے مکالمات ان کے کلام کی زینت ہیں۔ بلکہ ایک مقام پر انہوں نے

اپنی اس نسبت کا ذکر قدرے فخریہ انداز میں بھی کیا ہے یعنی ۔ع۔
''

برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است !
''(۱)

اب اگر مثنوی مولانا روم کے بارے میں عارف جامی کے یہ اشعار مبنی بر حقیقت ہیں کہ:

مثنویٔ مولویٔ معنوی
ہست قرآن در زبانِ پہلوی
(۲)

من چہ گویم وصفِ آں عالیجناب
نیست پیغمبر و لے دارد کتاب
(۳)

تو یقیناً علامہ اقبال مرحوم بھی دورِ حاضر کے ''ترجمان القرآن'' قرار دینے جانے کے مستحق ہیں۔
علامہ مرحوم خود بھی اس کے مدعی ہیں کہ ان کے اشعار فکر و پیغامِ قرآنی ہی کی ترجمانی پر مشتمل ہیں اور اس پر انہیں اس درجہ وثوق اور اعتماد ہے کہ انہوں نے ''مثنوی اسرار و رموز'' کے آخر میں ''عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمین'' کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحر فمِ غیر قرآں مضمر است
(۴)

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را زخارم پاک کن
(۵)

روز محشر خوار و رسوا کن مرا!
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا!
(٦)

آخری مصرع کو پڑھ کر ہر وہ شخص کانپ اٹھتا ہے جسے کسی بھی درجے میں علامہ کی نبی اکرم ﷺ سے محبت کا اندازہ ہے۔ ۔۔ اور واقعہ یہ ہے کہ خود میں نے جب بھی یہ اشعار پڑھے ایک مرتبہ ضرور جھرجھری سی آگئی اور دل لرز اٹھا کہ اللہ اکبر! اپنے حق میں اتنی بڑی بد دعا! لیکن پھر اس خیال سے تسکین ہوتی رہی کہ در اصل اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم کو کس _____ فارسی اشعار کا ترجمہ مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

درجہ پختہ یقین تھا اس بات پر کہ انہوں نے اپنے کلام میں قرآن ہی کی ترجمانی کی ہے۔(۱)

۱۔۔۔۔ روحِ دین کی تشریح و تعبیر

جہاں تک روحِ دین کی تشریح و تعبیر کا تعلق ہے علامہ مرحوم کی خدمات کو منفی و مثبت دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔۔ چنانچہ ایک طرف انہوں نے بنیادی اعتقادات اور اساسی فکر کے ضمن میں ہمہ اوستی نظریات اور شیخ ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کی عامیانہ تعبیرات کی پرزور تردید کی اور جواباً وہ نظریہ پیش کیا جو اقبال کے فلسفۂ خودی کے نام سے موسوم ہے اور اصلاً حضرت مجدد رحمہ اللہ تعالی کے نظریۂ وحدت الشہود سے مشابہ ہے۔۔۔ اور دوسری طرف عبادات کے میدان میں نری رسم پرستی (RITUALISM) کی زور دار نفی کی اور اثباتاً عبادت کی اصل روح یعنی عشق و محبتِ خداوندی پر زور دیا۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جہاں تک ہمہ اوست کی مختلف تعبیروں کے مابین فرق یا ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کی باریکیوں کا تعلق ہے، ان کی وضاحت کا یہ مناسب موقع ہے _____ (۱) یہاں راقم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ چند سال قبل جب مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ آنکھ کے آپریشن کے لیے لاہور میں مقیم تھے اور آپریشن میں کسی وجہ سے تاخیر ہورہی تھی تو فرصت کے اس وقت کا مصرف مولانا نے یہ نکالا کہ علامہ اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام از ابتدا تا انتہا نظر سے گزار لیا۔ لاہور کے تمام رفقاء و احباب جانتے ہیں کہ اس کے نتیجے کے طور پر طویل عرصے تک ایک خاص کیفیت مولانا پر طاری رہی اور حسبِ عادت مولانا نے اپنے تاثر کا اظہار بھی برملا اور واشگاف الفاظ میں فرمایا۔ اس سلسلے میں مولانا

کے تاثر کی شدت کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل دو جملوں سے لگایا جا سکتا ہے جو راقم الحروف کے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں:
ایک یہ کہ قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی اور نہ کرسکے۔ لیکن علاقہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے بہت پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں!۔ دوسرے یہ کہ اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا حدی خواں اس امت میں پیدا ہوا لیکن یہ امت ٹس سے مس نہ ہوئی تو ہما شما کے کرنے سے کیا ہوگا! (اسرار احمد)

نہ ہی میں اس کا اہل ہوں اور نہ ہی اس کا اصل مسئلے سے کوئی تعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسائل بہت دقیق ہیں اور ان کا سمجھنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ اصل خرابی اس طرح واقع ہوئی کہ ان نظریات کا پرچار اشعار کے ذریعے کیا گیا جو زبان زدِ خواص و عوام ہوگئے۔ اب خواص نے تو انہیں ہضم بھی کرلیا اور رچا پچا کر جزو بدن بھی بنالیا لیکن عوام کے لیے یہ زہر ہلاہل بن گئے اور انہوں نے ان کو عمل سے گریز اور فرار کا بہانہ بنا لیا۔
اقبال کا جہاد اصلاً ان نظریات کے ان عمومی اثرات ہی کے خلاف ہے جو حافظؔ اور جامیؔ کے اشعار کے ذریعے عوام کے اذہان پر مترتب ہوئے اور جن کے نتیجے میں امت کے ایک بڑے حصے میں سکر، جذب، مستی اور بالآخر فنا کا ذوق پیدا ہوگیا لیکن عمل اور جہاد کا جذبہ ختم ہوتا چلا گیا۔

فلسفۂ خودی

بدقسمتی سے علامہ مرحوم کے فلسفۂ خودی نے مختلف بلکہ متضاد تشریحوں اور تعبیروں کے باعث ایک چیستاں کی صورت اختیار کرلی ہے اور معاملہ بالکل وہی ہوا ہے کہ۔
ع۔ ''شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا!''

آسانِ تفہیم کے لیے یوں کہا جا سکتا ہے کہ علامہ کے فلسفے کا بنیادی پتھر انسان کی ہستی کی نفی کے بجائے اثباتِ ذاتِ خویش ہے۔ نتیجۃً ان کے پیش نظر ''سلوک'' کی انتہائی منزل ''فنا فی اللہ'' نہیں بلکہ ''بقا باللہ'' ہے۔
اس نکتے کی وضاحت کے لیے اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے میں خود علامہ مرحوم کی اس تحریر کے بعض حصے آپ کو سناتا ہوں جو انہوں نے پروفیسر نکلسن کی اس فرمائش پر کہ علامہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو ایک مختصر لیکن جامع مضمون کی صورت میں بزبانِ انگریزی تحریر کردیں، سپرد قلم کی تھی اور جسے پروفیسر موصوف نے ''مثنوی اسرار خودی'' کے ترجمے (SECRETS OF THE SELF) کے شروع میں شائع بھی کردیا تھا (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) اپنی اس تحریر میں علامہ فرماتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کے بارے میں میرا یہ نظریہ ہیگل اور اس کے ہم خیالوں اور اربابِ وحدت الوجود سے بالکل مختلف ہے، جن کے خیال میں انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ خدایا حیاتِ کلی میں جذب ہوجائے اور اپنی انفرادی ہستی کو مٹا دے۔۔۔ میری رائے میں انسان کا اخلاقی اور مذہبی منتہائے مقصود یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے یا اپنی خودی کو فنا کردے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی

ہستی کو قائم رکھے۔۔۔ قربِ الٰہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہوجائے بلکہ اس کے برعکس یہ کہ خدا کو اپنے اندر جذب کرلے۔۔۔(۱)

میں نے افلاطون کے فلسفے پر جو تنقید کی ہے اس سے میرا مطلب ان فلسفیانہ مذاہب کی تردید ہے جو بقا کے عوض فنا کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔۔۔ ان مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہیے۔ حالانکہ انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور انہیں اپنا خادم بنالے، اس وقت انسان ''خلیفۃ اللہ'' کے مرتبے کو پہنچ جائے گا۔۔۔''(۲)

میں اگر اس حقیقت کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کروں تو وہ یوں ہوگی کہ اس پورے سلسلۂ کائنات مادی اور تمام عالمِ کون و مکان کی طرح خود انسان کا مادی وجود یا اس کا وجودِ حیوانی بھی خالص وہمی و خیالی اور اعتباریٔ محض ہے، سوائے اس کی انا، یا من، یا ذات، یا خودی، کے جو در اصل عبارت ہے اس کی اس روح سے جو اس کے وجودِ حیوانی میں پھونکی گئی اور جس کی اضافت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی طرف کی ہے بفحوائے آیۂ قرآنی:

''فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ ﴿ ۷۲ ﴾'' (۳)، یعنی جب میں اس کو پوری طرح درست کردوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تب گر پڑنا اس کے لیے سجدے میں!۔۔۔ یہ روحِ انسانی نہ وہمی وخیالی ہے نہ عارضی وفانی بلکہ حقیقی اور واقعی بھی ہے اور دائم و باقی بھی! خدایا روحِ کائنات یا انائے کبیر اور اس روحِ انسانی یا انائے صغیر میں ایسا قریبی رابطہ اور لازم و ملزوم کا رشتہ ہے کہ انسان اسے

ے ۱: یہاں علامہ مرحوم نے ''تخلقوا باخلاق اللہ'' کا حوالہ بطور حدیثِ رسول دیا ہے لیکن اصلاً یہ الفاظ کسی حدیث کے نہیں بلکہ صوفیا کے ایک مشہور مقولے کے ہیں! ۲: غالباً یہی مفہوم ہے علامہ مرحوم کے اس مشہور مصرع کا کہ

۔ ع۔ یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ!

ے یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات!

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات
ے سورۃ الحجر آیت ۲۹ اور سورۃ ص آیت ۷۲

پہچان لے تو خدا کو جان جاتا ہے(۱)
اور اگر اسے نہ پہچان پائے تو کبھی خدا کی معرفت بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ یا عکساً یوں کہہ لیں کہ اگر کوئی خدا کو پہچان لے تو اپنی عظمت سے واقف ہوجاتا ہے اور اگر خدا کو بھلا دے تو اپنی حقیقت بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی ہے۔(۲)
خالق و مخلوق اور عبد و معبود یا انائے کبیر اور انائے صغیر یا علامہ کے الفاظ میں انائے مطلق (INFINITE EGO) اور انائے محدود (FINITE EGO) کے مابین اصل رشتہ باہمی عشق اور محبت کا ہے بفحوائے آیاتِ قرآنی:
وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ (البقرۃ:۱۶۵)
اور (حقیقی) ایمان والے سب سے زیادہ شدید محبت کرتے ہیں خدا کے ساتھ !
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ (الصف:۴)
یقیناً اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے ،(۳)
ان لوگوں سے جو جنگ کرتے ہیں اس کی راہ میں ۔۔۔۔
اور اسی باہمی رشتۂ الفت و محبت کا مظہر خارجی ہے جسے قرآن ولایت باہمی سے تعبیر کرتا ہے:
اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ (البقرہ:۲۵۷)
اللہ اہل ایمان کا ولی ہے۔
اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾ (یونس:۶۲)
آگاہ ہوجاؤ اللہ کے ولیوں کے لیے نہ کوئی خوف ہے نہ حزن !
اب ظاہر ہے کہ جس کسی کو اس عشق کی حقیقی لذت حاصل ہوگئی وہ اس کے دوام و بقا کا خواہشمند ہوگا نہ کہ اس کے انقطاع اور خاتمے کا! اور ظاہر ہے کہ بقائے عشق بقائے ذات پر منحصر ہے اور

(۱) یہ ترجمہ ہے صوفیاء کے اس مقولے کا جو عموماً حدیثِ رسول کی حیثیت سے بیان کردیا جاتا ہے یعنی: ''من عرف نفسہ فقد عرفہ ربہ''(۲) یہ ترجمہ ہے آیہ قرآنی کا۔ وَ لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنۡسٰىہُمۡ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۱۹﴾ (سورۃ الحشر آیت ۱۹)(۳) اس آیۂ کریمہ کو پڑھتے ہوئے میرا ذاہن علامہ مرحوم کے اس شعر کی جانب لازماً

منتقل ہوجاتا ہے کہ ؎
محبت مجھے ان نوجوانوں سے ہے ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند !

فنائے ذات کا لازمی نتیجہ خاتمۂ عشق ہے۔ بس یہیں سے علامہ مرحوم کے فلسفے کا دوسرا اہم نکتہ سمجھ میں آسکتا ہے یعنی عشق خداوندی اور اس کا دوام اور محبت الٰہی اور اس کا ''سوزِ ناتمام''۔ ؎

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیروز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام !

(۷)

دوامِ ماز سوزِ ناتمام است
چوماہی جز تپش برما حرام است !

(۸)

ہر لحظۂ نیا طور، نئی برقِ تجلی،
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے !

الغرض اثباتِ ذاتِ خویش اور دوامِ عشقِ الٰہی علامہ مرحوم کے فلسفۂ خودی کے دو ستون ہیں، اور یہ دونوں ظاہر ہے کہ باہم لازم و ملزوم ہیں۔ علامہ کے ان دو اشعار میں ان کا یہ باہمی لزوم بہت نمایاں ہے۔ یعنی ؎

میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی !

اور ؎

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے؟ یہی طغیانِ مشتاقی !

یہ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے کہ اسی عشقِ الٰہی کا ایک عکس عشقِ رسول بھی ہے۔ اس لیے کہ کون ہے جو نہیں جانتا کہ اطاعت و محبت دونوں کے اعتبار سے اللہ اور رسول ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ مرحوم کے کلام میں عشقِ رسول کا جذبہ تانے بانے کے مانند پیوست ہے۔ جیسے ؎

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست !
(۹)

یا

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است !
(۱۰)

روح شریعت: عشقِ الٰہی

روحِ دین کی تعبیر کے ضمن میں، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا، علامہ مرحوم کی دوسری بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے نری رسم پرستی اور خشک فقہی و قانونی موشگافی کی پرزور مذمت کی اور دین و شریعت کے جملہ مظاہر کی اصل روح باطنی عشقِ الٰہی کو قرار دیا۔ اپنے مرشد کے اتباع میں جس نے نعرہ لگایا تھا کہ ؎

شاد باد اے عشقِ خوش سودائے ما !
اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما !
(۱۱)

انہوں نے بھی واشگاف الفاظ میں کہا ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصوّرات !

اور ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا سجود بھی حجاب میرا قیام بھی حجاب !

اور فریاد کی کہ ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

یا

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

اس لیے کہ جملہ اعمال کی روح عشقِ الٰہی ہے۔ اسی کی لپک بلال رضی اللہ عنہ کی اذان میں تھی اور اسی کی دمک تلقینِ غزالی رحمہ اللہ میں ! بقول علامہ مرحوم: ؎

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ
عشقِ خدا کا رسول، عشقِ خدا کا کلام !

عشقِ فقیہہ حرم، عشقِ امیر جنود
ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام !
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات !

اور ؎

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبر حسینؓ بھی ہے عشق !
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق !

۲۔ نظامِ دین کی توضیح و تفسیر

نظامِ دین حق کی جو تشریح علامہ مرحوم کے کلام میں نظر آتی ہے اسے بغرض تفہیم تین اجزا میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اور یہ تینوں در حقیقت ایک ہی مرکزی نکتے کی شرح اور ایک ہی ''نقطۂ توحید'' کی توسیع (Extension) کی حیثیت رکھتے ہیں:

ع

یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں !

(۱)۔ مثلاً عام تمدنی اور معاشرتی سطح پر وحدِ خالق ہی وہ اساسی تصور ہے جس سے وحدتِ انسانیت کا خیال جنم لیتا ہے اور جس میں مزید گہرائی و گیرائی وحدتِ آدم کے تصور سے پیدا ہوتی ہے اور نتیجۃً انسانی حریت، اخوت اور مساوات کے اصول مستنبط ہوتے ہیں، چنانچہ نظامِ دین حق کے اس پہلو پر بہت زور علامہ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ میں اس وقت طوالت کے خوف سے ان دو اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

مردِ مؤمن کی شان میں علامہ مرحوم فرماتے ہیں:

کل مومن اخوۃ اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گلش
(۱۲)

نا شکیبِ امتیازات آمدہ
در نہادِ او مساوات آمدہ
(۱۳)

(ب)۔ اسی طرح ہیئتِ سیاسی کے ضمن میں توحیدِ الٰہی ہی کے اصلُ الاصول سے مستنبط ہوتا ہے یہ اساسی قاعدہ کہ حاکمیت صرف خدا کے لیے ہے، ماسِوی کی حاکمیت پر مبنی نظامِ سیاسی مجسم شرک ہے۔ غور کیجیے کہ کتنے سادہ لیکن پر شکوہ الفاظ میں ادا فرمایا ہے علامہ مرحوم نے یہ قاعدہ کلیہ : ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری۔

کسی ہیئت سیاسی میں تصوّرِ حاکمیت کے بعد سب سے اہم مسئلہ "امر جامع" کا ہے یعنی یہ کہ اس ہیئت سیاسی میں شریک افراد کو باہم ایک دوسرے سے جوڑنے والی چیز کونسی ہے ! اس ضمن میں اس زمانے میں وطنی قومیت کا جو تصوّر پوری دنیا میں رائج ہے، حیرت ہوتی ہے کہ علامہ مرحوم نے اس کی شناعت کا احساس کسی شدت سے کیا اور اس شجرِ خبیثہ کی خباثت کا کس قدر صحیح اندازہ لگایا۔ سنیے اور سر دھنیے: ؎

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے ، جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

(ج)۔ یہی معاملہ نظامِ معیشت کا بھی ہے۔ توحید کا اصول جس طرح حاکمیت اور قومیت کے تمام مروجہ تصورات کی نفی کلی ہے، اسی طرح ملکیت مطلقہ کے عام تصور کی بھی کامل نفی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر "ملک" اللہ کا ہے تو "مِلک" بھی اللہ ہی کی ہے اور اگر زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس

سب کا "مَلِک" (بادشاہ) اللہ ہے تو یقینا "مالک" بھی اللہ ہی ہے۔

گویا انسان خود بھی اللہ کا ہے (انا للہ) اور جو کچھ اس کے پاس ہے، خواہ وہ اس کی اپنی ذات اور اس میں مخفی قوتیں، صلاحیتیں اور اس کی مہلتِ عمر ہوں، خواہ اس کا مال و اسباب یا زمین و جائیداد، سب اصلاً اللہ کی ملکیت ہیں اور اس کے پاس اللہ کی امانت، جس میں تصرف کا اختیار تو اسے دیا گیا ہے لیکن اصل مالک کے احکام کے اندر اندر۔ ملکیت کے بجائے امانت کا یہ تصور توحید کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے جس سے کوئی فرار ممکن نہیں۔ بقول شیخ سعدی رحمہ اللہ ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
در حقیقت مالکِ ہر شے خدا ست
(۱۴)

افسوس کہ جب دینِ الٰہی کے چہرے پر ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام کی نقاب پڑ گئی تو اس کے روئے منور کے دوسرے خدوخال کی طرح یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور یہ علامہ مرحوم کی ژرف نگاہی اور حقیقت بینی کا شاہکار ہے کہ انہوں نے نکتۂ توحید کی اس لازمی توسیع (Extension) کو بھی حد درجہ واضح الفاظ میں بیان کردیا: ؎

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اور ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

نہ صرف یہ بلکہ مرحوم نے اس اصول کو بھی بہت وضاحت کے ساتھ پیش فرما دیا جو تاریخ انسانی کے دوران پہلی بار خلافتِ راشدہ کے زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا تھا، یعنی ریاست کی جانب سے تمام شہریوں کی کفالتِ عامّہ۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

کَس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس!
(۱۵)

اور ؎

جو حرفِ "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

اس سلسلے میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں علامہ مرحوم کے یہ اشعار:

چیست قرآن؟ خواجہ را پیغام مرگ
دستگیرِ بندہ بے ساز و برگ !

(۱۶)

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو !
لَنْ تَنَالُوا البِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا

(۱۷)

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن
کس نداند لذت قرضِ حسن

(۱۸)

از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ

(۱۹)

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاع بدن و ملکِ خداست

(۲۰)

بندۂ مومن ایں، حق مالک است
غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

(۲۱)

رایتِ حق از ملوک آمد نگوں
قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں

(۲۲)

آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم "کنفس واحدۃ"

(۲۳)

نفسِ قرآن تا دریں عالم نشست
نفس ہائے کاہن و پاپا شکست

(۲۴)

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ
ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ
(۲۵)
محفلِ ما بے مے و بے ساقی است
سازِ قرآن را نواہا باقی است ا ؎

(۲۴) _____ ا ؎ اشارہ ہے اس حدیث نبوی کی طرف جس میں خبر دی گئی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے بھی سوائے اس کے رسم الخط کے کچھ باقی نہ رہے گا۔ (رواہ البیہقی عن علی رضی اللہ عنہ)

------(۴)-------
اقبال اور قرآن

اب میں اس چوتھی اور آخری بات کے بارے میں کچھ عرض کرکے اپنی گزارشات ختم کردوں گا جس کے ضمن میں میں نے ابتداء میں یہ عرض کیا تھا کہ میرا گمان ہے کہ مجھے علامہ مرحوم کی روح سے ایک خصوصی نسبت حاصل ہے۔ یعنی مرحوم کا تعلق قرآنِ حکیم سے اس موضوع کا اہم ترین حصہ تو پہلے ہی زیر بحث آچکا ہے۔ یعنی یہ کہ علامہ مرحوم کی حیثیت فی الواقع "ترجمان القرآن" کی ہے، اور جیسا کہ خود ان کا دعویٰ ہے ان کا فکر بھی قرآن ہی پر مبنی ہے اور ان کا پیغام بھی قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔ لہذا اب میں اس موضوع کے بعض ضمنی مگر نہایت اہم پہلوؤں کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کراؤں گا۔

ا: عظمتِ قرآن کا نشان

اس سلسلے میں سب سے پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرے نزدیک اس دور میں علامہ مرحوم کی شخصیت عظمتِ قرآن کے ایک عظیم علم اور نشان (SYMBOL) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ ایک عام آدمی کا متوارث عقیدے کے طور پر قرآن مجید کو اللہ کی کتاب ماننا اور بات ہے، اور ایک ایسے شخص کا قرآن پر وثوق و اعتماد اور ایمان و یقین جو فکرِ انسانی کی تمام وادیوں میں گھوم پھر چکا ہو اور مشرق و مغرب کے تمام فلسفے

کھنگال چکا ہو، بالکل دوسری بات ہے۔

سب جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا اصل اور عظیم ترین معجزہ قرآنِ حکیم ہے۔ اب خود اعجازِ قرآنی کے پہلو بے شمار اور بے حدو نہایت ہیں جن کا احاطہ یا احصاء کسی فرد بشر کے لیے ممکن نہیں۔ اور میرے نزدیک اس دور میں اعجازِ قرآنی کا عظیم ترین مظہر یہ ہے کہ وہ کتاب جسے دنیا کے سامنے آج سے چودہ سو برس قبل عرب کے ایک امی شخص (صلی اللہ علیہ وسلم وفداہ ابی و امی) نے پیش کیا تھا، آج بھی جبکہ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے، مادی علوم انتہائی بلندی کو چھو رہے ہیں اور علم و ہنر کی دنیا میں انقلاب آچکا ہے، نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی کی جملہ ضرورتوں کو پورا کرسکتی ہے!

اور اسی کی ایک گواہی اور شہادت ملتی ہے علامہ مرحوم کی زندگی سے کہ ایک شخص جس نے انیسویں صدی کے اواخر میں شعور کی آنکھ کھولی۔ پھر یہ نہیں کہ پوری زندگی "بسم اللہ کے گنبد" ہی

میں بسر کردی ہو بلکہ وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر علم حاصل کیا، مشرق و مغرب کے فلسفے پڑھے، قدیم و جدید سب کا مطالعہ کیا۔ لیکن بالآخر اس کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے، اور اس کی علم کی پیاس کو آسودگی حاصل ہوسکی تو صرف کتاب اللہ سے، گویا بقول خود ان کے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

کیا اس دور میں قرآن حکیم کے "ھدیً للناس" ہونے کے لیے کسی اور دلیل کی حاجت باقی رہ جاتی ہے؟ اور کیا یہ کافی ثبوت نہیں ہے اس کا کہ قرآن ہر دور اور ہر ذہنی سطح کے انسان کی فکری رہنمائی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے؟

۲: واقفِ مرتبہ و مقامِ قرآن

اور اسی کا ایک عکس سمجھیے اس حقیقت کو کہ اس دور میں عظمتِ قرآن اور مرتبہ و مقامِ قرآن کا انکشاف بھی جس شدت کے ساتھ اور جس درجہ میں علامہ اقبال پر ہوا، شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو! اس لیے کہ عظمتِ قرآنی کا انکشاف بہرحال کسی شخص پر اس کے اپنے ظرفِ ذہنی کی وسعت اور عمق کی نسبت ہی سے ہوسکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ علامہ جب قرآن کا ذکر کرتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ۔ع۔

"قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید"

کے مصداق وہ فی الواقع جمال و جلالِ قرآنی کا مشاہدہ اپنے قلب کی گہرائیوں سے کر رہے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ شنید نہیں، دید پر مبنی ہے، بلکہ ایسے لگتا ہے جیسے ان کا پورا وجود کلامِ پاک کی عظمت کے بارِ گراں سے "خاشعا متصدعا" ہوا جا رہا ہے، عظمتِ قرآنی کا احساس و ادراک ان کے ریشے ریشے میں سرایت کیے ہوئے اور ان کا ہر بنِ مو قرآن کی جلالت قدر اور رفعتِ شان کے ترانے گا رہا ہے۔ ذرا گوشِ ہوش سے سنیے: ؎

آں کتابِ زندہ، قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم

(۲۷)

نسخۂ اسرارِ تکوین حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

(۲۸)

حرفِ او را ریب نے، تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

(۲۹)

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃ للعالمین

(۳۰)

رہزناں از حفظِ او رہبر شدند ا ؎
از کتابے صاحبِ دفتر شدند

(۳۱)

آنکہ دوشِ کوہ بارش برنتافت
سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت
(۳۲)

اور سوچیے کہ کیا اس کلام میں دور دور بھی کسی آورد کا سراغ ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آمد ہی آمد ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ قائل کا قول نہیں، حال ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ "از دل خیزد بردل ریزد" کی اعلی مثال ہے۔
اور اسی پہ بس نہیں، آگے بڑھیے اور سنیے: ؎
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
(۳۳)

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں
(۳۴)

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
(۳۵)

بات کتنی سیدھی اور سادہ معلوم ہوتی ہے، قرآن عام معروف معنوں میں کتاب نہیں یہ اللہ کا کلام ہے اور کلام خود متکلم کی صفت اور اس کی جملہ صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ لہذا قرآن مثل ذات باری تعالیٰ 'ظاہر' بھی ہے اور 'باطن' بھی اور 'زندہ' بھی ہے 'قائم و دائم' بھی۔ پھر نہ ذاتِ باری زمان و مکان کی مقید ہے نہ کلامِ الہی ان کا پابند، بلکہ جیسے خود اللہ تعالیٰ اول بھی ہے اور آخر بھی اور زمان و مکان کل کے کل وجود باری میں گم ہیں اسی طرح کلام الہی کے بھی "صیدِ زبوں" کا درجہ رکھتے ہیں اور جس طرح اللہ کی شان یہ ہے کہ "کل یوم ھو فی شان" اسی طرح قرآن حکیم بھی ہر دور کے افق پر ایک خورشیدِ تازہ کے مانند طلوع ہوتا رہے گا ! لیکن واقعہ یہ ہے کہ کم از کم میرے محدود علم اور مطالعے میں قرآن حکیم کی اس سے زیادہ مدح و ستائش ہماری پوری تاریخ میں موجود نہیں۔ !

اب ظاہر ہے کہ تعریف معرفت کی مناسبت ہی سے کی جا سکتی ہے۔ بس اسی سے اندازہ کرلیجیے کہ عظمتِ قرآنی کے کتنے بڑے عارف تھے۔ علامہ اقبال مرحوم !

اور یہیں سے سمجھ میں آسکتی ہے یہ بات کہ کیوں اس قدر دکھ تھا علامہ مرحوم کو امت کی قرآن مجید کی جانب عدمِ توجہ کی روش سے، جس کا مرثیہ ان کے کلام میں جا بجا موجود ہے، اور کیوں ان کا _____ اے جس کی سب سے تابندہ مثال حضرت ابو ذر غفاری ہیں، رضی اللہ عنہ !

دلِ حساس خون کے آنسو روتا ہے اس پر کہ مسلمانوں کو، عام اس سے کہ وہ عوام میں سے ہوں یا خواص میں سے، قرآن سے نہ اعتناء ہے نہ دلچسپی ! غور فرمائیے کہ کتنی تلخی ہے علامہ کے اس شعر میں کہ : ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست !
کہ از یاسینِ او آساں بمیری ! !

(۳۶)

اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے علامہ مرحوم نے امت مسلمہ کے مختلف طبقات کا: ؎

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوّال مست !

(۳۷)

اتش از شعرِ عراق در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

(۳۸)

واعظِ داستاں زنِ افسانہ بند
معنیٔ او پست و حرفِ او بلند

(۳۹)

از خطیب و دیلمی گفتارِ او
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ او

(۴۰)

رہے "فقہیانِ حرم" تو ان کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ: ؎

خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقہیانِ حرم بے توفیق !

لہذا اب عوام کا تو کہنا ہی کیا، وہ غریب تو ہیں ہی "کشتہ ملائی و سلطانی وپیری" ان کی عظیم اکثریت بے ذوق بھی ہے اور بے طلب بھی، اور بقول علامہ مرحوم ؎

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب
العجب، ثم العجب، ثم العجب
(۴۱)

اور ظاہر ہے کہ یہاں طلب سے مراد تعمیرِ خودی کی طلب بھی ہے اور غلبہ حق کی آرزو بھی، اس لیے کہ فی زمانہ یہی دونوں نایاب ہیں اور انہی کا حال یہ ہے کہ: ؎

آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مرجاتی ہے یا رہتی ہے خام !

رہی دنیوی آرزوؤں اور طولِ امل کا جال تو اس میں تو ہر شخص ہی ع۔
کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا، کے مصداق بری طرح جکڑا ہوا ہے۔

ملت اسلامی کے اس حالِ زبوں کے بارے میں علامہ فرماتے ہیں:

پیشِ ما یک عالمِ فرسودہ است
ملت اندر خاکِ او آسودہ است
(۴۲)

رفتِ سوزِ سینۂ تاتار و کرد
یا مسلماں مرد یا قرآن بمرد!

(۴۳)

۳: داعی الی القرآن

علامہ مرحوم کے نزدیک قرآن سے یہی دوری اور کتابِ الٰہی سے یہی بعد اصل سبب ہے مسلمانوں کے زوال و اضمحلال کا اور امت مسلمہ کے نکبت و افلاس اور ذلت و خواری کا! جوابِ شکوہ میں جو بات انہوں نے حد درجہ سادہ الفاظ میں فرمائی تھی کہ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

بعد میں اس کا اعادہ نہایت پر شکوہ الفاظ اور حد درجہ درد انگیز اور حسرت آمیز پیرائے میں یوں کیا کہ:

خوار از مہجوریٔ اے قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

(۴۴)

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

(۴۵)

اور اب ان کے نزدیک اسی "کتاب زندہ" سے وابستہ ہے ان کا احیا اور اسی پر دار و مدار ہے ان کی نشاۃ ثانیہ کا! گویا مسلمانوں کی حیاتِ تازہ کا انحصار ہے ان کے از سرِ نو حقیقتاً مسلمان ہونے پر اور ان کے مسلمان ہونے کا دارومدار ہے قرآن حکیم پر۔۔ یا یوں کہہ لیں کہ ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ وابستہ ہے، احیائے اسلام، سے اور

احیائے اسلام وابستہ ہے، احیائے قرآن، سے جو عبارت ہے مسلمانوں کے اس کے ساتھ صحیح تعلق کی از سرِ نو استواری سے ! علامہ فرماتے ہیں:

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو
شیوہ ہائے کافری زندانِ تو !

(۴۶)

قطع کردی اَمرِ خود را در زُبُر
جادہ پیمائی الی شیء نکر

(۴۷)

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

(۴۸)

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب
تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب

(۴۹)

علامہ کے نزدیک علم ہے تو صرفِ علم قرآنی اور حکمت ہے تو صرف حکمتِ قرآنی اور یہی

_____ ۱ ؎ مہجوری کا لفظ استعمال کرکے علامہ قاری کے ذہن کو قرآن مجید کی اس آیت کی طرف منتقل کرنا چاہتے ہیں: ۔ وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ہٰذَا الْقُرْاٰنَ مَہْجُوْرًا ﴿ ۳۰ ﴾ (الفرقان آیت۔ ۳۰)

علم و حکمتِ قرآن ہے جو اگر کسی کے ذہن میں سرایت کرجائے اور قلب میں رچ بس جائے تو اس کے باطن میں ایک انقلاب برپا ہوجاتا ہے جو منتج ہوتا ہے ظاہر کے انقلاب پر اور یہی وہ عمل ہے جو بالآخر ایک عالمی انقلاب کو جنم دے سکتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم وہ کتاب ہے کہ:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود

(۵۰)

اور کس خوبصورتی سے مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ اس قرآن کے ذریعے ایک عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لیے کمربستہ ہوجاؤ:

بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست
ایں جہاں اندر بر او چوں قباست !

(۵۱)

چوں کہن گردد جہانے دربرش
می دہد قرآن جہانے دیگرش

(۵۲)

یک جہانے عصر حاضر را بس است !
گیرا گر در سینہ دل معنی رس است !

(۵۳)

اور کہیں للکارتے اور غیرت دلاتے ہیں کہ:

اے کہ می نازی بہ قرآن عظیم
تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم؟

(۵۴)

در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن
نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن !

(۵۵)

علامہ کے نزدیک تطہیرِ ذہن اور تعمیرِ فکر کا واحد ذریعہ تو یہ ہے ہی کہ "اسرار دیں" فاش کیے جائیں اور نوعِ انسانی کے سامنے "نکتہ ہائے شرعِ مبیں" کی وضاحت کی جائے، خود تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کا کارگر اور مؤثر ذریعہ بھی قرآن حکیم ہی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
ز انکہ او گم اندر اعماق دل است

(۵۶)

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

(۵۷)

اور

جز بقرآن ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآن اصلِ شاہنشاہی است

(۵۸)

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکرِ را کامل ندیدم جز بذکر

(۵۹)

لیکن یہ ذکر صرف زبان سے ہی نہیں پورے وجود سے ہونا چاہیے:

ذکر؟ ذوق و شوق را و اون ادب
کارِ جان است ایں نہ کارِ کام و لب

(٦٠)

الغرض علامہ کے نزدیک امت کے جملہ امراض کے لیے نسخۂ شفا بھی قرآن حکیم ہے اور ملت کے تن مردہ میں ازِ سرِ نو جان ڈالنے کے لیے آبِ حیات بھی چشمۂ قرآنی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

برخور از قرآن اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ ام آب حیات

(٦١)

می دہد ما راپیامِ لَاتخف
می رساند بر مقام لا تخف

(٦٢)

گوہرِ دریائے قرآن سفتہ ام
شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام

(٦٣)

فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست
جوئے ساحل ناپذیر از فیضِ اوست

(٦٤)

بس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام !
(٦٥)

اور

ازیکِ آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملت ز قرآن زندہ است !
(٦٦)

ماہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست
(٦٧)

چوں گہر در رشتہ او سفتہ شو !
ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو !
(٦٨)

گویا احیائے دین کی جدوجہد ہو یا تجدیدِ ملت کی سعی، علامہ مرحوم کے نزدیک اس کا مرکز و محور ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ ہے قرآنِ حکیم، اوریہی معنی ہیں قرآن حکیم کی اس آیت کے جو نبی اکرم ﷺ کے طریقِ کار اور منہجِ انقلاب کی وضاحت کے ضمن میں معمولی سے لفظی فرق کے ساتھ قرآن مجید میں چار مقامات پر وارد ہوئی ہے یعنی: یتلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ اوریہی ہے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے کرنے کا وہ اصل کام [۱۷]

جس پر ایک طویل عرصے تک ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بالآخر میری نگاہ جم گئی ہے کہ ''جا ایں جا است''۔ _____ [۱۷] یہ دراصل نام ہے میرے ایک کتا بچے کا جو میری اس تحریر پر مشتمل ہے جو میں نے جون ٦٧ء میں میثاق کے صفحات میں لکھی تھی اور جو میری موجودہ سرگرمیوں کے لیے بمنزلۂ اساس ہے۔ اس کے اب تک آٹھ ایڈیشن، اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام، کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ برادر عزیز ڈاکٹر ابصار احمد سلمہ نے کیا ہے، جسے مکتبہ انجمن نے شائع کیا ہے۔ (اسرار احمد)

آخر میں، میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا اور ساتھ ہی آپ سب کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری ان گزارشات کو صبر اور سکون کے ساتھ سنا۔ خود میں نے جو محنت اس سلسلے میں کی ہے اس کا اصل سبب یہ ہے کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کے بقا و استحکام، ملت اسلامی کی تجدید و نشاۃ ثانیہ اور دینِ حق کے احیاء و اظہار ا ے ایسے اہم اور جلیل مقاصد کے ضمن میں علامہ اقبال کے فکر اور پیغام کی اشاعت کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے اور پاکستانی عوام میں بالعموم اور نوجوان نسل میں بالخصوص جو بعد رفتہ رفتہ علامہ مرحوم کی شخصیت اور افکار و نظریات سے پیدا ہوتا جارہا ہے، حالات کا ایک شدید تقاضا ہے کہ اسے کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپ چاہیں تو اسے "احیائے اقبال" کا نام دے لیں۔ بہرحال یہ وقت کی ایک اہم ضرورت اور اسی کی ایک حقیر سی سعی ہے جو میں نے کلامِ اقبال سے یہ مواد جمع کرکے مرتب صورت میں آپ کے سامنے پیش کرکے کی ہے۔

اب اگر میری ان گزارشات سے آپ میں سے کسی ایک کے دل میں بھی یہ جذبہ بیدار ہوجائے اور ایک عزمِ مصمم پیدا ہوجائے کہ وہ قرآن ہاتھ میں لے کر ایک عالمگیر اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو، تب تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت پوری طرح سپھل ہوگئی اور گویا "شادم از کردگی، خویش کہ کارے کردم" اور اگر بدرجۂ ادنیٰ میری ان گزارشات سے آپ حضرات کے دلوں میں کلامِ اقبال کے مطالعے ہی کا شوق بیدار ہوجائے تب بھی میں یہ جانوں گا کہ میری محنت کم از کم ضائع نہ ہوئی۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ا ے ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ۙ (التوبۃ: ۳۳، الفتح: ۲۸، الصف: ۹)

اردو ترجمہ اشعارِ فارسی

(۱)۔ ایک برہمن زادہ (یعنی علامہ اقبال خود) روم (مراد ہیں مولانا رومی) اور تبریز (مراد ہیں شمس تبریزی) کے علوم کا حامل اور ان کے اسرار و رموز سے واقف ہے۔

(۲)و(۳)۔ مثنوئ مولوئ معنوی یعنی مثنوی مولانا روم در اصل فارسی زبان میں قرآن ہی کی ترجمانی ہے اور میں ان (مولانا روم) کی صفات اس کے علاوہ اور کیا بیان کروں کہ وہ اگرچہ پیغمبر نہیں ہیں لیکن انہیں کتاب بہرحال عطا ہوئی ہے۔

(۴)تا(٦)۔ اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو، اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا کسی اور کی ترجمانی ہے، تو (اے نبی ﷺ) آپ میرے فکر کے ناموس کا پردہ خود چاک فرما دیں اور اس چمن کو مجھ ایسے خار سے پاک کردیں (مزید برآں) حشر کے دن مجھے خوار و رسوا کردیں اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مجھے اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرما دیں !

(۷)۔ تو ابھی اس راز سے آگاہ نہیں ہوا کہ وصل سے شوق ختم ہوجاتا ہے۔ (کاش کہ تو جان لے کہ) ہمیشہ کی زندگی کیا ہے؟ مسلسل سلگتے رہنا ! (نہ کہ ایک بار بھڑک کر ختم ہوجانا !)

(۸)۔ ہماری بقا سلگتے رہنے ہی میں ہے۔ اور ہم پر مچھلی کی طرح تڑپتے رہنے کے سوا ہر شے حرام ہے۔

(۹)۔ جسے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ محبت کی دولت حاصل ہے تو گویا دنیا کا کل خشک و تر اس کے دامن کے ایک گوشے میں موجود ہے۔

(۱۰)۔ خود کو درِ مصطفٰے تک پہنچا کر دم لو۔ اس لیے کہ اگر تم اس مقام تک نہ پہنچ سکے تو سمجھ لو کہ پھر بولہبی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آسکے گا !

(۱۱)۔ اے مرے جذۂ عشق۔ اے میری عزیز متاع اور اے میرے جملہ امراض کے معالج، تو سدا شاد و آباد رہے !

---

(۱۲)و(۱۳)۔ اس کے (یعنی بندۂ مومن) کے دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہے کہ "تمام اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں ! " اسی طرح جذبۂ حریت بھی اس کے ضمیر میں رچا بسا ہوا ہے، وہ (نسلی، لسانی یا علاقائی) امتیازات سے بالکل ناواقف ہے اور مساوات اس کی سرشت میں موجود ہے !

(۱۴)۔ یہ (میرا جملہ مال و اسبابِ دنیوی) میرے پاس ایک عارضی امانت ہے، ورنہ ہر شے کا مالکِ حقیقی تو خدا ہی ہے !

(۱۵)۔ شریعتِ حقہ اور نظامِ اسلامی کا اصل مقصود یہی ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔

(١٦)۔ (جانتے ہو؟) قرآن کی حقیقت کیا ہے؟ سرمایہ دار کے لیے موت کا پیغام اور بے سروسامان لوگوں کا سہارا و آسرا !

(١٧)۔ دولت سمیٹنے والے سے کسی بھلائی کی توقع نہ کرو۔ (اس لیے کہ قرآن نے صاف فرما دیا ہے کہ) تم نیکی کا مقام ہرگز حاصل نہیں کرسکتے جب تک (بجائے سمیٹنے اور جمع کرنے کے) خرچ کرنے کی عادت نہ ڈالو !

(۱۸)۔ سود سے سوائے فساد کے اور کس چیز میں اضافہ ہوسکتا ہے؟ (افسوس کہ) بغیر سود قرض دینے کی لذت کسی کو معلوم نہیں !

(۱۹)۔ سود سے روح تاریک اور دل اینٹ پتھر کی طرح سخت ہوجاتا ہے اور انسان بغیر دانتوں اور پنجوں کے درندہ بن جاتا ہے۔

(۲۰)۔ زمین سے اپنے لیے رزق کا حصول جائز ہے۔ (لیکن) یہ انسان کے لیے صرف استعمال کی چیز ہے، ملکیت صرف خدا کی ہے۔

(۲۱)۔ بندۂ مومن (اپنے مال و متاع کا صرف) امین ہے، مالک خدا ہے۔ خدا کے سوا جو کچھ دیکھتے ہو سب فانی اور ہلاک ہوجانے والا ہے!

(۲۲)۔ حق کا پرچم بادشاہوں کے باعث نیچا ہوجاتا ہے اور ان کی وجہ سے بستیاں کی بستیاں خوار و بدحال ہوجاتی ہیں۔

(۲۳)۔ ہمارا آب و دانہ ایک ہی دسترخوان سے ہے۔ اس لیے کہ آدم کا پورا خاندان ایک

جان کے مانند ہے۔

(۲۴)۔ جب اس دنیا میں قرآنی تعلیمات کا سکہ چلا تو کہانت اور پاپائیت ایسے تمام گمراہ کن سلسلوں کا زور ٹوٹ گیا۔

(۲۵)۔ مسلمانوں سے کہو کہ جان ہتھیلی پر رکھ لیں (یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لیے کمر کس لیں) اور جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو وہ سب (اللہ کی راہ میں) دے ڈالیں!

(۲۶)۔ (لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوسکتا اس لیے کہ) ہماری محفل ساقی اور شراب سے تہی دست رہ گئی ہے یعنی قرآن کے ساز کی صرف آواز ہی آواز باقی رہ گئی ہے!

(۲۷)۔ وہ زندہ کتاب، قرآن حکیم، جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی!

(۲۸)۔ زندگی کے وجود میں آنے کے رازوں کا خزینہ۔ جس کی حیات افروز اور قوت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کرسکتے ہیں۔

(۲۹)۔ اس کے الفاظ میں نہ کسی شک و شبہ کا شائبہ ہے نہ ردوبدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔

(۳۰)۔ نوعِ انسانی کے لیے (خدا کا) آخری پیغام۔ جس کے لانے والے تمام جہانوں کے لیے رحمت قرار پائے (صلی اللہ علیہ وسلم)

(۳۱)۔ اسے یاد کرلینے کے باعث یا اس کی حفاظت میں آکر رہزن اور لٹیرے رہبر و رہنما بن گئے اور ایک کے طفیل وہ خود بہت سی کتابوں کے مصنف بن گئے!

(۳۲)۔ وہ (کتاب) کہ جس کے بوجھ کو پہاڑ بھی نہ اٹھا سکے اور جس کے دبدبے سے آسمان کا پتہ بھی پھٹ کر رہ گیا!

(۳۳)۔ (اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے !

(۳۴)۔ یہ ذات حق سبحانہ و تعالیٰ (کا کلام ہے لہٰذا اسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی۔ اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی !

(۳۵)۔ اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار

زمانے موجود ہیں !

(۳۶)۔ (لیکن افسوس کہ اے مسلمان !) تجھے اس کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورۂ یسین کے ذریعے موت کو آسان کرلے !

(۳۷)۔ ادنیٰ لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوّال کے نغمے کی شراب ہی مدہوش ہے !

(۳۸)۔ اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں !

(۳۹)۔ (دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پرشکوہ اور بلند و بالا ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے !

(۴۰)۔ اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادی سے ماخوذ ہوتی ہے یا امام دیلمی سے اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف، شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے !

(۴۱)۔ کوئی صاحبِ قرآن ہو اور پھر بھی اس میں نہ جذبہ ہو نہ حوصلہ و امنگ، یہ کتنی تعجب خیز اور حیرت آمیز بات ہے ! !

(۴۲)۔ ہمارے سامنے ایک پرانا اور گھساپٹا عالم ہے اور ملت اسلامی اس کی خاک نشینی ہی میں آسودگی محسوس کر رہی ہے۔

(۴۳)۔ (مسلمان اقوام مثلاً) مغلوں اور کردوں کے سینے حرارت سے کیوں خالی ہوگئے؟ آیا مسلمان پر موت طاری ہوگئی ہے یا خود قرآن ہی کے حیات بخش سوتے خشک ہوگئے ہیں !

(۴۴)۔ (اے مسلمان !) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دور اور بے تعلق ہوگیا ہے لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے !

(۴۵)۔ اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے) اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتابِ زندہ موجود ہے ! (جس کے ذریعے تو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے !)

(۴۶)۔ اے مسلمان ! تیرا ایمان رسومات کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے اور تو خود کفر کے طور طریقوں کے زندان میں اسیر و مقید ہے !

(۴۷)۔ تو نے اپنی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کرلیا ہے اور اب ایک خوفناک انجام کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے !

(۴۸)۔ (اب) اگر تو (دوبارہ) مسلمان ہوکر جینے کا خواہش مند ہے تو (اچھی طرح جان لے کہ) اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی حیاتِ نو کی بنیاد قرآن پر قائم کرے !

(۴۹)۔ اس کتاب کا حقِ تلاوت تم ادا کردو۔ پھر جو مقصد و مطلب چاہو حاصل کرلو۔

(۵۰)۔ (یہ کتاب حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کرجاتی ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہوجاتا ہے اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آجاتی ہے !

(۵۱)۔ بندۂ مومن آیاتِ خداوندی میں سے ہے اور اس عالمِ کی حیثیت بس ایسی ہے جیسی اس کے لباس میں ایک قبا۔

(۵۲)۔ جب اس کے لباس کی کوئی قبا یعنی کوئی عالم پرانا ہوجاتا ہے تو قرآن اسے ایک جہانِ نو عطا فرما دیتا ہے۔

(۵۳)۔ عصرِ حاضر کو بھی بس ایک ایسا ہی جہانِ نو درکار ہے (جو قرآن سے ماخوذ اور مستنبط ہو !)۔ اے مسلمان اگر تیرے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو معانی کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرسکتا ہو تو (مجھ سے) یہ راز کی بات حاصل کرلے !

(۵۴)۔ اے وہ شخص یا قوم جسے حاملِ قرآنِ عظیم ہونے پر فخر ہے، آخر کب تک حجروں اور گوشوں میں دبکے رہوگے؟

(۵۵)۔ (اٹھو اور) دنیا میں دینِ حق کے اسرار و رموز کو عام کرو اور شریعتِ اسلامی کے رموز و حکم کی تشہیر و اشاعت کے لیے سرگرم ہوجاؤ۔

(۵۶)۔ شیطان کو بالکل ہلاک کردینا ایک نہایت مشکل کام ہے، اس لیے کہ اس کا بسیرا نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں ہے !

(۵۷)۔ بہتر صورت یہ ہے کہ اسے قرآن حکیم کی (حکمت و ہدایت) کی شمشیر سے گھائل کرکے مسلمان بنا لیا جائے !

(۵۸)۔ قرآن کے بغیر شیر بھی گیدڑ بن جاتا ہے اور اصل بادشاہی قرآن کے تعلیم کردہ فقر میں ہے۔

(۵۹)۔ جانتے ہو یہ قرآن کا فقر کیا ہے؟ یہ ذکر اور فکر دونوں کے جمع ہونے سے وجود میں آتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ بغیر ذکر کے فکر کامل نہیں ہوسکتا۔

(٦٠)۔ (لیکن یہ بھی جان لو کہ ذکر کی حقیقت کیا ہے) ذکر اصل میں ذوق و شوق کو صحیح راہ پر ڈالنے کا نام ہے۔ یہ محض زبان اور ہونٹوں کا وظیفہ نہیں بلکہ کامل وجود اور پوری ہستی کے ساتھ کرنے کا کام ہے۔

(٦١)۔ (اے مسلمان) اگر دوام وثبات اور قوت و استحکام کا طالب ہے تو قرآن کے سامنے دستِ سوال دراز کر۔ اس لیے کہ مجھے قرآن ہی کے مخفی چشموں میں آب حیات کا سراغ ملا ہے !

(٦٢)۔ یہ ہمیں بے خوفی کا پیغام ہی نہیں دیتا، بالفعل اس مقام تک پہنچا بھی دیتا ہے جہاں نہ خوف باقی رہتا ہے (نہ حزن !)

(٦٣)۔ میں نے قرآن کے بحر بیکراں کے موتی بیندھ لیے ہیں اور "صبغۃ اللہ" کے اسرار و رموز کی شرح بیان کردی ہے۔

41

(٦٤)۔ میرے فکر کی یہ بلندی اور گردوں نوردی سراسر قرآن ہی کے فیض سے ہے اور اسی کے طفیل میرے خیالات میں بحرِ بیکراں کی سی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔

(٦٥)۔ پس (اگر خدا توفیق دے تو) میری شراب کے ایک دو جام چڑھا یعنی میرے فکر اور پیغام سے سرشار ہوکر آمادۂ عمل ہوجاتا کہ تو شمشیرِ برہنہ کے مانند چمکنے لگے !

(٦٦)۔ وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملتِ اسلامی کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔

(٦٧)۔ ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں، ہمارا قلبِ زندہ اور ہماری روحِ تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔

(٦٨)۔ (اے ملت اسلامی ! اب بھی وقت ہے کہ تو) اپنے آپ کو موتیوں کی طرح قرآن کی رشتے میں بیندھ اور پرولے۔ ورنہ پھر اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ خاک اور دھول کے مانند پریشان اور منتشر (اور ذلیل و خوار) رہ !

42

فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ

اور

ہماری قومی ذمّہ داریاں
خطاب بہ مجلس اقبال
الحمراء آڈیٹوریم۔۔۔۔۔۔۔۲۱ اپریل ۸۶ء
از
اسرار احمد
امیر تنظیم اسلامی و صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن

احمدہ و اصلی علی رسولہ الکریم

اما ابعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ رب اشرح لی صدری۔ و یسر لی امری۔ و احلل عقدۃ من لسانی ۔ یفقہوا قولی۔

محترم و مکرّم صدرِ مجلس !
محترم اراکین و کارکنانِ مرکزیہ مجلسِ اقبال لاہور،
اور معزز خواتین و حضرات !

اگرچہ اس سے قبل بھی متعدد بار ع "بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش " کے مصداق مجلسِ اقبال میں شرکت و شمولیت کی سعادت حاصل ہوچکی ہے لیکن اس بار جس انداز میں اس بندۂ ناچیز کا اعزاز و اکرام فرمایا گیا ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مناسب الفاظ واقعۃً میرے پاس موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا مجبوراً ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم کے الفاظ مستعار لے رہا ہوں کہ ع

"اِک بندۂ عاصی کی ۔۔۔۔ اور اتنی مداراتیں۔۔ !۔"

مجھے آج صبح ہی کی فلائٹ سے "شامِ الہدیٰ" کے مستقل پروگرام کے لیے کراچی روانہ ہوجانا تھا لیکن مجلسِ اقبال میں شرکت کی سعادت کے لیے یہ ادنیٰ سا تردد تو ہرگز کوئی قربانی نہیں کہ یہاں سے سیدھا ائیرپورٹ اور ائیر

پورٹ سے سیدھا تاج محل ہوٹل کراچی پہنچوں۔ البتہ منتظمینِ مجلس کا یہ احسان عمر بھر یاد رہے گا کہ انہوں نے خاص طور

45

پر میری شمولیت کے لیے مجلس کا آغاز اپنے طے شدہ پروگرام سے ایک گھنٹہ پہلے کیا ۔۔۔ اس کے ساتھ ہی اپنی اس محرومی کا احساس بھی شدت سے ہے کہ آج سے ڈیڑھ سال قبل کی ایک مجلس کی طرح آج بھی مجھے اپنی گفتگو ختم کرتے ہی آدابِ مجلس کے خلاف فوراً روانہ ہوجانا ہوگا اور اس طرح میں اپنے سے بدرجہا اعلم و افضل اصحابِ علم و فضل کے افکار و خیالات سے مستفید نہ ہوسکوں گا۔ بہرحال " مالا یدرک کلہ لایترک کلہ" کے مصداق جو میسر آگیا ہے غنیمت ہے!

بہت سے حضرات یقیناً اس پر حیران ہوں گے کہ 'میں اپنی روایت کے یکسر خلاف 'آج اپنے خیالات تحریری صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام معمول سے ہٹ کر اس بار ' مجلسِ اقبال ' کے لیے بھی ایک موضوع تجویز کردیا گیا ہے یعنی "فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ داریاں" اور یہ موضوع اوّلاً تو خطیبانہ جوش سے زیادہ سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے۔۔۔ ثانیاً اس کا اندیشہ ہے کہ زبانی گفتگو کی رواداری میں اس کا کوئی اہم گوشہ تشنہ رہ جائے! ۔۔۔۔ پھر ایک خواہش یہ بھی ہے کہ یہ باتیں جلد از جلد وسیع پیمانے پر لوگوں کے سامنے لائی جائیں اور من و عن شائع ہوں لہٰذا "نٓ والْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ " کے مطابق ذہن و لسان کے مابین قلم کو خیالات کی شیرازہ بندی کے ذریعے کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

عنوان میں اختیار کردہ ترتیب سے ذرا سا ہٹ کر میں پہلے "حالاتِ حاضرہ" کے ضمن میں اپنا مشاہدہ اور تجزیہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:
آج ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ ہم نے معمارِ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم کے اس اندیشے کے عین مطابق جو ان کے اس تاریخی جملے میں سامنے آتا ہے کہ :۔

46

God Has given us a golden opportunity to prove our worth as architects of a new nation and let it not be said that we did'nt prove equal to the task
اپنی نا اہلی اور عدم قابلیّت کا بھرپور ثبوت دیتے ہوئے ان کے قائم کردہ پاکستان کو تو آج سے لگ بھگ ساڑھے چودہ

سال قبل دو لخت کرالیا تھا۔۔۔ اب اندیشہ یہ ہے کہ مفکّر و مصوّرِ پاکستان علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں جس پاکستان کا خواب

"An independent Muslim State at least in the North-West of India"

کی صورت میں دیکھا تھا کہیں ہم اسے بھی اپنی نا اہلیوں کی بھینٹ نہ چڑھا دیں ! اور اس طرح برّصغیر پاک و ہند کی مسلم قوم کی نصف صدی سے زائد عرصہ پر پھیلی ہوئی مساعی حبط اعمال کے حسرتناک انجام سے دوچار نہ ہوجائیں !۔۔۔۔ اس لیے کہ ایک طرف ع "خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زبان میری" کے مصداق تاحال 'بے آئینی' ہی سرزمین پاکستان کا 'آئین' ہے۔ گویا قمری حساب سے اپنی قومی زندگی کے چالیس سال پورے کرچکنے کے باوجود (واضح رہے کہ آنے والے ماہِ رمضان مبارک کی ستائیسویں کو یہ چالیس سال پورے ہوجائیں گے !)

ہم ؎

چہل سالِ عمرِ عزیزت گذشت
مزاجِ تو از حالِ طفلی نہ گشت

کے مصداق سیاسی و دستوری اعتبار سے ہنوز 'نابالغ' ہیں ! تو دوسری طرف ۔۔۔ صاف نظر آتا ہے کہ ع "آہ ! وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف"۔۔۔۔ اور ؎

"چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

کے مصداق اس قافلۂ ملی کی کوئی منزل معین ہے ہی نہیں ! اور یہ "ہجومِ مومنیں" بے مقصدیت کے صحرائے تیہہ میں بالکل اس شان سے بھٹک رہا ہے کہ

؎

کس طرف جاؤں، کدھر دیکھوں، کسے آواز دوں
اے ہجومِ نا امیدی دل بہت گھبرائے ہے !

چنانچہ اغیار طعنے دے رہے ہیں اور پھبتیاں چست کر رہے ہیں، مبصرین اور تجزیہ نگار انتشار (DISINTEGRATION)) اور حصے بخرے ہوجانے

(Blakanisation) کی پیشین گوئیاں کر رہے ہیں اور دشمن گھات میں ہیں کہ کب آخری ضرب لگانے کا بہترین موقع ہاتھ آئے اور ع "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود" کے مصداق عصرِ حاضر کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ختم کردیا جائے۔ !

گویا 'نظر بظاہر' یوں محسوس ہوتا ہے کہ ؎

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں

پاکستان کی فضا پر متذکرہ بالا عمومی تشویش اور بَد دلی و مایوسی کے جو بادل چھائے ہوئے ہیں ان کے درمیان جھانک کر واقعات کی دنیا میں "حالات حاضرہ" کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا مشاہدہ کیا جائے تو صورتِ حال کچھ یوں نظر آتی ہے کہ:

ایک جانب سیاچین گلیشئر ہمارے ہاتھ سے جا چکا ہے، اور کشمیر کی کنٹرول لائن آئے دن کی بھارتی جارحیّت سے خون آلود ہوتی رہتی ہے۔ پھر کشمیر کے علاوہ ہماری حسّاس ترین سرحد سے ملحق بھارتی پنجاب شدید خلفشار اور عدم استحکام کا شکار ہے اور اس کے ضمن میں کوئی دن نہیں جاتا جب بھارتی زُعما میں سے کوئی نہ کوئی ہمیں مورِ الزام نہ ٹھہراتا ہو۔ نتیجۃً پاکستان سے بھارت کی پیدائشی دشمنی اور مستقل نفسیاتی اور واقعاتی آویزش پر مستزاد یہ فوری اور شدید اندیشہ سر پر منڈلا رہا ہے کہ کسی بھی وقت اپنے اندرونی خلفشار کے باعث جھنجھلا کر بھارت کسی بڑی جارحیّت کا ارتکاب نہ کر گذرے !

دوسری جانب افغانستان کی صورتِ حال اور اس کے داخلی نظریاتی تصادم پر مستزاد روس کی ننگی اور براہِ راست مداخلت اور امریکہ کی قدرے ڈھکی چھپی اور بالواسطہ دخل اندازی نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کے لیے شدید مسائل اور خطرات پیدا کر رکھے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان ، افغانستان اور روسی ترکستان کے پورے علاقے کی قسمت کو گویا ایک معلق ترازو سے وابستہ کردیا ہے۔ چنانچہ جہاں اس کی بھی امید ہے کہ ایک مردِ درویش کے لگ بھگ

پون صدی قبل کے الفاظ کہ ؎

اِک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند!

حقیقت و واقعیت کا روپ دھار لیں اور یہ خطّہ ایک وحدت کی صورت اختیار کرکے اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز بن جائے، وہاں یہ خطرہ بھی حقیقی اور واقعی ہے کہ سائبیریا کا برفانی ریچھ بحیرۂ عرب کے گرم پانی میں غوطہ لگانے کے لیے آخری دوڑ کا آغاز کردے اور 'خاکم بدہن' پاکستان بھی اس کی عریاں جارحیت کا نشانہ بن جائے!

داخلی محاذ پر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پاکستان کی ماں اور معمار پاکستان اور مصور پاکستان دونوں کی مشترک وراثت مسلم لیگ جو ان دونوں کے منظرِ عام پر آنے سے قبل واقعۃ صرف نوابوں اور نواب زادوں، اور وڈیروں اور جاگیرداروں کی جماعت تھی البتہ ۳۵ء اور ۴۷ء کے درمیان ایک عوامی تحریک کی صورت اختیار کر گئی تھی عرصہ ہوا کہ ع

"ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!"

کی مصداق کامل بن چکی ہے۔ اور حال ہی میں سرکاری و درباری ذرائع سے اس کے تنِ مردہ میں جان ڈالنے کی جو کوشش ہوئی ہے اور غیر جماعتی انتخابات میں اپنے ذاتی وسائل اور محض زمینداری یا سرمایہ داری کے بل پر کامیاب ہونے والوں کی پیشانی پر اس کا لیبل چسپاں کرکے اس کے نام سے فائدہ اٹھانے کی جو کوشش کی گئی ہے کون نہیں جانتا کہ اس کا حاصل کچھ نہیں اور کم از کم عوام کی سطح پر اس کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ حیثیت۔

اس طرح 'بظاہر موجود لیکن حقیقتاً کالعدم مسلم لیگ' سے قطع نظر۔۔۔ قومی سیاست کے میدان میں انتہائی بائیں جانب ہیں وہ اشخاص اور گروہ جن کی پاکستان کو توڑ دینے کی خواہش اب ڈھکی چھپی نہیں رہی بلکہ ببانگ دہل سامنے آچکی ہے۔ ان میں شخصیات کی سطح پر تو اہم نام صرف خان عبدالغفار خان اور جی ایم سیّد کے ہیں البتہ چھوٹی بڑی جماعتیں یا گروہ نصف درجن بلکہ اس سے بھی زائد ہیں جن میں اہم تر نام این ڈی پی، پی این پی، اور سندھی بلوچی پختون متحدہ محاذ کے ہیں! تاہم غنیمت ہے کہ ابھی ان سب کا دائرہ اثر

صرف چھوٹے صوبوں تک محدود ہے اور پنجاب کی حد تک اس کی صرف ایک خفیف سی صدائے بازگشت جناب حنیف رامے کی صورت میں سامنے آئی ہے!

دوسری انتہا پر ہیں بعض نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتیں، جن کی اکثریت واضح طور پر دائیں بازو سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں بھی قابلِ ذکر تو تین ہی ہیں یعنی جے یو آئی، جے یو پی اور جماعتِ اسلامی تاہم دوسری نسبتاً چھوٹی جماعتوں اور بڑی جماعتوں کے متحارب دھڑوں کو بھی شمار کیا جائے تو تقریباً وہی بائیں بازو والی تعداد بن جاتی ہے۔۔۔ یہ جماعتیں اگرچہ پاکستان کے بقاء و استحکام کی بھی دل سے خواہش مند ہیں اور اس میں اسلام کے نفاذ کی بھی داعی ہیں لیکن اولاً اس بنا پر کہ ان کا دائرہ اثر بہت محدود بھی ہے اور ملک کے طول و عرض میں مختصر ٹکڑوں (SMALL POCKETS) کی صورت میں منتشر بھی، اور ثانیاً اس بنا پر کہ پاکستان اور اسلام دونوں کی محبت اور وفاداری کی عظیم قدرِ مشترک کے باوجود ان کی باہمی آویزش بلکہ چپقلش ضربُ المثل کی صورت اختیار کر گئی ہے، وہ کوئی فیصلہ کن کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نظر نہیں آتیں!

ان دو انتہاؤں کے مابین واقعہ یہ ہے کہ قومی اور عوامی سیاست کا اصل دھارا سیکولر ڈیماکریسی یا سوشل ڈیماکریسی کے رخ پر بہہ رہا ہے جس میں یوں تو جماعتی اور تنظیمی سطح پر دو نام سامنے آتے ہیں یعنی ایک پاکستان پیپلز پارٹی کا اور دوسرا تحریکِ استقلال کا۔۔۔۔۔ لیکن بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ عظیم دھارا اصلاً کچھ چھوٹی اور بڑی، اور نئی اور پرانی شخصیتوں اور ان کے مداحوں اور حامیوں، اور عاشقوں اور جان نثاروں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی سرتوڑ کوششوں میں مصروف ہیں اور سرِ دست یہ کہنا مشکل ہے کہ اس عظیم لہر پر سواری کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔۔۔۔ گویا

دیکھیے! اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

اسی درمیانی دھارے میں ایک طوفانی لہر حال ہی میں آنسہ بے نظیر بھٹو کی اپنی اختیاری جلا وطنی کو ختم کر کے پاکستان واپسی۔۔۔۔ اور شہرِ اقبال لاہور میں ورود۔

اور اس موقع پر ان کے بے مثال اور حد درجہ والہانہ استقبال، اور پھر پاکستان کے دل پنجاب، اور اس کے بھی اصل قلب یعنی لاہور، گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور فیصل آباد وغیرہ کے اضلاع میں ان کے شاندار اور والہانہ خیر مقدم اور عظیم الشان جلسوں اور جلوسوں کی صورت میں اٹھی ہے جس نے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے کسی بھی درجہ میں بہرہ ور ہر پاکستانی مسلمان کو نہ صرف یہ کہ ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے بلکہ ملک و ملت کے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور غالباً یہ بھی اسی کا شاخسانہ ہے کہ 'مجلسِ اقبال' بھی جو ایک خالص روایتی اور ثقافتی ادارہ بن چکی تھی "فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ

داریوں" کا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئی ہے۔

ہماری قومی اور عوامی سیاست کے اصل اور عظیم تر درمیانی دھارے میں جو طوفانی لہر حال ہی میں اٹھی ہے اس کے ضمن میں یہ بات بھی بالکل غلط نہیں ہے کہ یہ کسی حد تک آٹھ نو سال کے سیاسی حبس کا ردِّ عمل ہے اور اس بات میں بھی یقیناً کچھ نہ کچھ صداقت موجود ہے کہ حالیہ طوفانی کیفیت زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکتی، گویا ع "چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی" ۔۔۔ لیکن اس قسم کے جملہ عوامل کا حصہ منہا کرنے کے بعد بھی اس کیفیت (PHENOMENON) کی اہمیت ہرگز کم نہیں ہوتی اور اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے کہ اس کے اصل عوامل کیا ہیں، اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور اس کے ضمن میں ملک و ملت کے مخلصوں اور بہی خواہوں کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔۔۔ اس لیے کہ جہاں یہ اندیشہ موجود ہے کہ اس طوفانی لہر کے جوش کو ٹھنڈا پڑتے دیکھ کر اس پر سوار قائدین بے قابو ہو جائیں اور جھنجھلاہٹ میں کوئی غلط اقدام کر بیٹھیں، وہاں اس کے سرکاری یا غیر سرکاری مخالفین کا غلط طرز عمل اور MIS HANDLING بھی نہایت خوفناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔۔ جس کا ایک تجربہ ہم پندرہ سال قبل مشرقی پاکستان کے معاملے میں کر چکے ہیں۔

میں جب علامہ اقبال کے فکر کی روشنی میں عوامی سیاست کے اس درمیانی دھارے اور اس کی موجودہ طوفانی لہر کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے بعینہٖ وہی صورت نظر آتی ہے جو حضرتِ علامہ نے اس تہذیب حاضر کے تجزیے کے ضمن میں پیش فرمائی ہے جو اپنے آغاز کے اعتبار سے تو یقیناً مغربی اور یورپی تھی لیکن اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے دیکھتے ہی دیکھتے عالمی اور آفاقی بن گئی تھی اور اس وقت پورے کرۂ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے ۔۔۔ اور جس کی خودکشی کی خبر بھی علامہ مرحوم نے اب سے لگ بھگ پون صدی قبل دی تھی کہ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والوں خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا۔

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ حضرت علامہ کے نزدیک اس تہذیب کے اصل ازجائے ترکیبی دو ہیں: ایک اس کی اصل ریڑھ کی ہڈی ہے جس کی صلابت اس کے قیام و بقا کی اصل اساس ہے، 'خطبات' میں حضرت علامہ نے اسے

'INNER CORE' سے تعبیر فرمایا ہے۔۔۔ اور اسے خالص قرآنی الاصل گویا صد فی صد اسلامی قرار دیا ہے۔ یعنی الفاظِ قرآنی: {وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿ ۳۶ ﴾} (بنی اسرائیل:۳۶) کے مطابق یہ طرز اور روش کہ اپنے موقف کی بنیاد نہ توہمات پر قائم کی جائے نہ نرے ہوائی تخیلات پر بلکہ مشاہدات و تجربات اور ان پر مبنی ٹھوس استدلال پر قائم کی جائے۔ حضرت علامہ کی یہ رائے نہایت صائب اور حد درجہ اہم ہے اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہی قرآنی ہدایت و رہنمائی تھی جس نے ایک جانب مظاہرِ قدرت کو آیاتِ الٰہیہ کا تقدس عطا فرمایا ۱؎ اور انسان کو کتابِ فطرت کے سائنٹیفک مطالعے اور مشاہدے کی جانب متوجہ کیا ۲؎ اور دوسری جانب منطق کو استخراج کی تنگنائیوں سے نکال کر

۱؎ سورة البقرہ: آیت ۱۶۴

۲؎ سورة الغاشیہ آیات : ۱۷ تا ۲۰

استقراء کی وسعتوں اور پہنائیوں سے روشناس کرایا۔۔۔ اور اس طرح جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے میدانِ ہموار کیا۔ چنانچہ یہی چیز یورپ میں تحریکِ احیاء علوم کی بنیاد بنی جس کے نتیجے میں یورپی اقوام اوجِ ثریا پر پہنچیں اور یہ صورت پیدا ہوئی کہ: ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

حضرت علامہ یہ ژرف نگاہی بجائے خود جس عظمت کی مظہر ہے اس سے قطع نظر میرے لیے اس کی قدر و قیمت کا ایک اضافی پہلو یہ ہے کہ اس سے نبی اکرم ﷺ کے ایک اہم قول کی عظمت و صداقت مبرہن ہوتی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "ان اللہ یرفع بھذا الکتب اقواماً و یضع بہ اٰخرین"۔ اب اللہ تعالیٰ اسی کتاب (قرآن) کے ذریعے قوموں کو ابھارے گا اور اسی کے (ترک کرنے کے) باعث قوموں کو گرائے گا!"۔ گویا مغربی تہذیب بھی جو ابھری تو یقیناً قرآن ہی کی ہدایت و رہنمائی کے ایک اہم جزو کے سہارے ابھری! اور مسلمان گرے تو اسی سبب سے گرے کہ انہوں نے قرآن کی اس ہدایت سے یورپ کو روشناس کرانے کے بعد خود اسے ترک کردیا گویا ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

اور

خوار از مہجوئ قرآن شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمین افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

۲۔ تہذیب حاضر کا دوسرا جزو اس کے کچھ خارجی مظاہر ہیں جنہیں خطبات میں تو حضرت علامہ نے صرف ایک لفظ 'DAZZLING EXTERIOR' سے تعبیر فرمایا ہے لیکن اشعارِ اقبالؔ کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مظاہرِ خارجی کے بھی دو رخ ہیں جنہیں کہیں تو حضرتِ علامہ "چہرہ روشن' اندروں چنگیز سے تاریک تر" کے الفاظ سے تعبیر فرماتے ہیں' کہیں ان کی نشاندہی ع
"طبِّ مغرب کے مزے میٹھے اثر خواب آوری"

جیسے الفاظ کے ذریعے کرتے ہیں ۔۔۔ اور اس ضمن میں غالباً سب سے زیادہ بھرپور اندازیہ ہے کہ ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تہذیبِ حاضر کے ان بظاہر حسین و خوشنما اور دل کش و مرعوب کن مظاہر خارجی میں سے مثلاً ایک حریت فکر ہے جس کے پردے میں یا باضابطہ کفر و الحاد ہے یا لا ادریت و ارتیابیت، اور ان دونوں کا حاصل ہے یا عریاں لامذہبیت یا کم از کم محدود مذہبیت کے پردے میں لپٹی ہوئی لادینیت ! گویا ؎
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ !

دوسرے حریت عمل ہے جس کی شکر والی تہہ کے نیچے مضمر ہے اباحیت اور آوارگی کا زہر' جس نے اخلاق کردار اور شرافت و انسانیت کا دیوالہ نکال دیا ہے، تیسرے نمبر پر ہے حریّتِ نسواں اور نظریۂ مساواتِ مردو زن جس نے مرد کو 'نامرد' اور زن کو 'نازن' بنا کر رکھ دیا اور دونوں کو تماشائی و ہرجائی بنا کر خاندان کے مقدس ادارے کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ؎

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

اور

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بے کار و زن تہی آغوش !

اسی طرح ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

کے مصداق اجتماعیاتِ انسانیہ کے ضمن میں تہذیبِ مغرب نے سیاسی و معاشی مساوات کے حسین عنوانوں سے انسان کو اوّلاً لا دینی جمہوریت (SECULAR DEMOCRACY) کا تحفہ دیا جو "چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر" کا مصداقِ کامل ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے حقیقتاً سرمایہ داروں کی بدترین آمریت عوام پر مسلط ہوگئی۔ ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اور اس کے بعد ، اس نہلے پر دہلا بے خدا اشتراکیت کا مارا جس نے انسان سے اس کی آزادی کو کلیۃً سلب کرکے اسے ایک مشین کا پرزہ بنا کر رکھ دیا۔ فاعتبروا

آگے بڑھنے سے قبل، اس مقام پر دو امور کی وضاحت مناسب ہے:

ایک یہ کہ تہذیبِ جدید کے اس المیے کا اصل سبب سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع کی روشنی میں ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے "علم الاسماء" پر تو پوری توجہ صرف کی جو ابتدائے آفرینش ہی میں حضرت آدم کی سرشت میں ودیعت کر دیا گیا تھا اور جس نے تاریخ انسان کے دوران مسلسل بروز ظہور اور صعود و ارتقاء کے ذریعے 'علم الاشیاء' اور 'علم الخواص' کے راستے سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی صورت اختیار کی۔۔۔ لیکن اس علمِ وحی سے یکسر منہ موڑ لیا جسے قرآن 'ہدایت' {فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی فَمَنۡ تَبِعَ ہُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾} [1] سے

سے تعبیر کرتا ہے۔ نتیجۃً اس نے اس 'دجال' کی صورت اختیار کر لی جس کی ایک آنکھ بند ہے اور جس کی پیشانی پر جلی حروف میں "ک ف ر" لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ اب یہ یک چشم عفریت نوع انسانی ہی نہیں ہر قسم کی حیاتِ ارضی کی کلی تباہی پر تلا کھڑا ہے!

دوسرے یہ کہ عالمِ اسلام میں اس تہذیب ضمن میں یہ متوازن نقطۂ نظر، میری محدود معلومات کی حد تک، سوائے علامہ اقبال مرحوم کے اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتا، اور ان کے بعد ان کی شمع سے اپنے چراغ روشن کرنے والوں میں بھی کم از کم اپنی محدود بصارت و بصیرت کی حد تک مجھے صرف ایک شخصیت ایسی نظر آتی ہے جس کے فکر میں اس توازن کا عکسِ کامل موجود ہے اور وہ ہیں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم و مغفور! ۔۔۔ ورنہ اکثر و بیشتر افراد و اشخاص کی حد تک بھی یا حیرانی و سرگردانی نظر آتی ہے، یا انتہا پسندی اور یک رخا پن! ۔۔۔ اور بحیثیتِ مجموعی بھی ملت کے دو اہم طبقات نے متضاد طرز عمل اختیار کیا۔ چنانچہ ایک طرف علماء کرام کی اکثریت نے اس تہذیب کو بالکلیہ رد کر دیا۔ نتیجۃً اس کے اس INNER CORE سے بھی محرومی اختیار کر لی جو اصلاً خالص قرانی اور اسلامی تھا۔ اور وہ صرف

---

[1] البقرہ: ۳۸

آسمانی ہدایت کے امین بن کر قال اللہ اور قال الرسول کے حصار میں محصور ہو کر رہ گئے۔ اور دوسری جانب قوم کی عظیم اکثریت نے تہذیبِ مغرب کو من و عن قبول کر لیا۔ نتیجۃً اس کے INNER CORE کے ساتھ ساتھ اس کی "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" سے پیدا شدہ "صناعی" کو بھی ایک شکست خوردہ اور مرعوب ذہنیت کے ساتھ جوں کا توں قبول کر لیا۔ نتیجہ وہ نکلا جسے کسی صاحبِ ورد نے یوں بیان کیا کہ ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر
تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیے

اور اس ضمن میں بھی اللہ رحمتیں نازل فرمائے اپنے اس بندۂ قلندر پر جس نے کمال انصاف کا ثبوت دیا جب ملت کے ان دو اہم طبقات کے تضادِ عمل کو یوں واضح کیا کہ ؎

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے
تہہ محراب مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟

فکرِ اقبالؔ کی اس روشنی میں پاکستان کی عوامی سیاست کے بڑے اور درمیانی دھارے اور اس کی حالیہ 'مہیب' لہر کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے بھی دو جزو سامنے آتے ہیں، چنانچہ اس کا بھی ایک INNER CORE ہے جو نہ غیر اسلامی ہے نہ غیر قرآنی، اور نہ افکار و نظریاتِ اقبال کے منافی ہے، نہ تصوراتِ قائد اعظم کی نقیض بلکہ عین قرآنی اور اسلامی بھی ہے اور پاکستان کے مصور و مفکر اور مؤسس و معمار دونوں کے خیالات کے مطابق بھی اور اسی میں اس دھارے کی مقبولیت اور اس کی قوت و شوکت کا راز مضمر ہے، البتہ دوسرا جزو جو بجائے خود نہایت اہم ہے بے خدا بھی ہے اور بے دین بھی اور خالص مشرکانہ بھی ہے اور ملحدانہ بھی ! اور یہ بات نہایت اہم اور لازمی ہے کہ ان دونوں اجزاء کو علیحدہ علیحدہ پہچان لیا جائے اور دونون کے ساتھ ایک طرز عمل اختیار کرنے کی بجائے علیحدہ علیحدہ رویہ اختیار کیا جائے !

اس دھارے اور لہر کی INNER CORE کے اجزاء ترکیبی میں سے اوّلین

جزو ہے۔ "ولقد کرمنا بنی آدم۔۔۔ الایۃ" کے مطابق انسان کا محض انسان ہونے کے ناطے اعزاز و اکرام اور تشریف و تکریم، اور رنگ و نسل، مال و منال، اور عہدے، پیشے یا جنس کی بنیاد پر انسانوں کے مابین اس سماجی و

معاشرتی سطح پر کامل مساوات ! بفحوائے الفاظ قرآنی: {یٰٓاَیُّہَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ وَّ اُنۡثٰی وَ جَعَلۡنٰکُمۡ شُعُوۡبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا ؕ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ ﴿۱۳﴾} (الحجرات:۱۳) اور بقول اقبالؔ

کل مومن اخوۃ، اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گلش
نا شکیبِ امتیازات آمدہ !
در نہادِ او مساوات آمدہ !

ان امتیازات کا کلی خاتمہ اور کامل انسانی مساوات کا بالفعل قیام رسولِ عربی ﷺ کا وہ طرہ امتیاز ہے جس کے سامنے ایچ جی ویلز جیسے دشمنِ اسلام اور شاتمِ رسول بھی اپنے آپ کو سر جھکانے پر مجبور پاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہی وہ چیز ہے جو موجودہ نام نہاد مسلمان معاشرے میں ناپید ہوچکی ہے، اس ضمن میں علامہ اقبالؔ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ

؎ "یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو۔
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو"

۔۔۔۔ میں ان کی روح سے معذرت کے ساتھ اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ ع
"تم سبھی کچھ ہو مگر سوچو کہ 'انسان' بھی ہو !"۔

اس 'INNER CORE' کا دوسرا اہم جزو ہے انسان کے بنیادی عمرانی حقوق (یعنی ۔۔۔ CIVIL RIGHTS) اور ان کے ضمن میں کامل سیاسی و قانونی مساوات ! جس سے "تمیزِ بند و آقا" کا مکمل خاتمہ ہوجائے اور نہ کوئی قوم کسی دوسری قوم پر حکمران ہو، نہ کوئی طبقہ دوسرے طبقے پر برتری کا حامل ہو اور نہ ہی کوئی علاقہ دوسرے علاقے پر بالا دستی کا حق جتائے، بلکہ نوع انسانی "کونوا عباد اللہ اخوانا" (الحدیث) پر عمل پیرا ہوجائے۔ (ترجمہ) تم سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ ! حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذاتِ اقدس اور جسم اطہر کو بھی قصاص کے لیے پیش فرما کر، حضرتِ

عمر رضی اللہ عنہ نے بھرے مجمع میں احتساب پر برافروختہ نہ ہوکر بلکہ بالفعل جوابدہی فرما کر، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں عدالت میں ایک عام مدعی کی حیثیت سے پیش ہوکر اور اپنے دعوت کے اخراج پر کبیدہ خاطر نہ ہوکر جو اعلیٰ و روشن اور ابدی و لازوال مثالیں قائم کی تھیں وہ آج متفق علیہ اقدار کی حیثیت سے انسان کے اجتماعی ضمیر کا جزو لاینفک بن چکی ہیں اور عہد حاضر کا انسان ان کو ACHIEVE اور REALISE کرنے کے لیے علامہ اقبالؔ کے ان پرشکوہ الفاظ کے مطابق ہاتھ پاؤں مار رہا ہے کہ

ہ

رکجا بینی جہانِ رنگ و بو
زانکہ از خاکش بروید آرزو !
یا زنورِ مصطفٰے او را بہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفٰے است !

لیکن چونکہ وہ نورِ نبوت سے براہ راست استفادہ کرنے پر آمادہ نہیں لہٰذا افراط و تفریط کے دھکوں کے سوا اسے کچھ حاصل نہیں ہورہا۔ تاہم کون نہیں جانتا کہ آج ان اقدارِ عالیہ سے سب سے بڑھ کر محروم اور سب سے زیادہ تہی دست و تہی دامن وہ ہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں ۔۔۔۔ اور اسی کا ردّ عمل ہے جو ہماری سیاست کے موجودہ ابھار کی اساس بنا ہے !

اس INNER CORE کا تیسرا لیکن اہم ترین جزو ہے معاشی عدل و انصاف اور کم از کم واقع کی حد تک کامل مساوات اور ہر نوع کے اقتصادی استحصال اور 'سرمایہ داری' کی لعنت کا مکمل خاتمہ اور ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت کا ذمہ ! ۔۔۔ یہ تمام باتیں وہ ہیں جو تمام جہانوں کے پروردگار نے اپنے کلامِ پاک میں ارشاد فرمائیں اور محمد ﷺ اور ان کے حواریین و خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بالفعل کرکے دکھائیں۔ چنانچہ "کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم" کے مطابق دولت کی منصفانہ تقسیم اسلام کے معاشی نظام کا اصل الاصول ہے اور "وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقہا" کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ : اگر دجلہ و فرات کے کنارے کوئی کتا

بھی بھوکا مر جائے تو اس کے لیے اللہ کے یہاں عمر ذمہ دار ہوگا"۔ اسلام کے اقتصادی مقاصد کے ضمن میں POLICY STATEMENT کی حیثیت رکھتا ہے جسے اقبال نے یوں تعبیر فرمایا کہ:

ے

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نقطۂ شرع مبیں ایں است و بس

اور

آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم "کنفسً واحدۃ"

لیکن افسوس کہ جب مسلمانوں کے دورِ زوال میں اس پر ملوکیت کے ساتھ ساتھ جاگیر داری اور سرمایہ داری کی چھاپ پڑ گئی تو اسلام اور قرآن کے رخِ روشن کی یہ جہاں تابیاں نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں وہ صورت بن گئی جس کا نقشہ حضرت علامہ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ے

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآن نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

نتیجۃً۔۔۔ قوم کی عظیم اکثریت تو اقبال کے اس شعر کا مصداق کامل بن ہی چکی ہے کہ ے

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو
لن تنا لوا البر حتی تنفقوا

خود 'مذہبیت' کی بھی اکثر و بیشتر صرف یہ مسخ شدہ صورت (PERVERTED FORM) باقی رہ گئی ہے کہ ہر قسم کے حرام و حلال ذرائع سے دولت سمیٹو البتہ کچھ صدقہ و خیرات کے کھاتے بھی جاری رکھو۔ چنانچہ حکومت کی جانب سے سود دے کر اس میں سے زکوۃ وصول کرلینے کا تماشا تو حال ہی میں ہوا ہے۔ سود لو اور اس میں سے زکوۃ دے دو، پر تو ہمارے مذہبی مزاج کے سرمایہ دار بزرگ بہت پہلے سے عمل پیرا ہیں۔

اس سلسلے میں نقد کے ضمن میں 'ربا النسیئۃ' اور 'ربا الفضل' کی جو بے شمار صورتیں سرکاری و غیر سرکاری

سطح پر ہماری پوری تجارت و صنعت اور ریاست کی سطح پر دفاع وترقی کی جملہ سکیموں میں رچی بسی ہوئی ہیں ان کا ذکر تو تحصیل حاصل ہے، اگرچہ حضرتِ علامہ کے یہ دو اشعار نقل کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ؎

از ربا آخر چہ می زاید فتن !
کس نداند لذتِ قرضِ حسن

59

از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ

تاہم 'زمین کے سود' کا ذکر ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس کے ضمن میں مذہبی سطح پر تو مغالطے موجود ہی ہیں شیدائیان اقبال کا ذہن بھی صاف نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ان اشعار کو تو لہک لہک کر پڑھتے ہیں کہ:

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا، فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اور

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں، میری نہیں

اور

رزق خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ملکِ خدا است

لیکن غالباً انہوں نے قرآن کی اس تعلیم اور اقبالؔ کی اس تبیین کو صرف اخلاقی وعظ کے خانے میں رکھا ہوا ہے، اور یہ نہیں جانتے کہ زمین کے سلسلے میں یہ اسلام کے قانونی و فقہی نظام کی اہم اساس ہے ! چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالی اور امام دار الہجرت مالک رحمہ اللہ تعالی دونوں کا متفقہ فتویٰ ہے کہ مزارعت مطلقاً حرام ہے اور اقبالؔ کا یہ فرمانا محض شاعری ؎

نہیں ہے کہ

خدا آں ملتے را سروری داد
کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت
بہ آں قومے سروکارے ندارد
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

چنانچہ سماجی، سیاسی اور معاشی جملہ سطحوں پر تمام نا انصافیوں اور ناہمواریوں کا خاتمہ کرکے دینِ حق کے کامل نظامِ عدل و قسط کو بالفعل نافذ و قائم کرنے کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے خاتم النبیین اور سید المرسلین، محمدن الامین صلی اللہ علیہ وسلم ! (بفحوائے الفاظ قرآنی {وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْؕ} (الشوری: ۱۵) اور {لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِۚ} (الحدید: ۲۵ اور ع

"خدایا آں کرم بارِ دگر کن !"

کے مصداق _____

؎ ع مرا یاراں غزلخوانے شمردند۔

اسی کا پیغام دیا تھا حکیم الامت اور مصوّر پاکستان علامہ اقبال مرحوم نے کہ ؎

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اونہ رسیدی تمام بولہبی است

چنانچہ اقبال سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ جہاں شعریت اور جذباتی سوز و ساز کے اعتبار سے کلامِ اقبال کے نقطۂ عروج کا مظہر ان کی دوسری نظمیں (خصوصاً ذوق و شوق) ہیں وہاں امتِ مسلمہ کے نام ان کے پیغام کا مظہرِ اتم و اکمل ہے، 'ابلیس کی مجلس شوری' اور خصوصاً اس کے یہ آخری اشعار: ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر! آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!

چنانچہ اس مردِ قلندر نے تو نہ صرف یہ کہ ع

"جوہرِ دریائے قرآن سفتہ ام"

کے مصداق قرآن حکیم کے حقائق و معارف کی دل نشیں پیرائے اور شعری اسلوب میں تعبیر و تعلیم میں اپنی توانائیاں کھپا دیں بلکہ ساتھ ہی 'انقلاب' کا نعرہ بھی بلند کردیا تھا۔۔۔ کہ

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب!! اے انقلاب!!!

یہ دوسری بات ہے کہ ان کے نام لیواؤں اور شیدائیوں نے ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا کہ ؎

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من
وز درونِ من نہ جست اسرارِ من

مزید برآں۔۔۔یہی تھی وہ حقیقت جسے تعبیر فرمایا تھا بابائے قوم اور بانیٔ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے کبھی ان الفاظ سے کہ ہم پاکستان کی صورت میں ایک ایسے خطہ ارضی کے خواہاں ہیں جس میں اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کا عہد حاضر میں

عملی اور مثالی نمونہ پیش کر سکیں۔ اور کبھی یہ فرما کر کہ "اسلام ایک سوشل ڈیماکریسی ہے"
(روایات بالمعنی)

لیکن افسوس کہ علامہ اقبال تو خالص 'مسنون عمر' میں پاکستان کے قیام سے لگ بھگ دس سال قبل ہی دنیا سے رخصت ہوگئے تھے، قائد اعظم مرحوم بھی قیامِ پاکستان کے بعد کل ایک سال زندہ رہے۔ اور ان کے بعد ان کی عوامی تحریک کا ثمرہ اچک لیا، اوّلاً نوابوں اور نوابزادوں اور زمینداروں، جاگیرداروں اور وڈیروں نے، اور بعد ازاں اس میں مستقل حصہ دار بن گئے کچھ نئے اور پرانے سرمایہ دار اور باری باری حصہ بٹاتے رہے اعلیٰ سول اور فوجی عہدہ دار! جس کے نتیجے میں قانونِ قدرت کے عین مطابق عوامی سطح پر ایک شدید احساس محرومی پیدا ہوا جو اندر ہی اندر سلگنے والی آگ کے مانند بڑھتا چلا گیا ۔ اور ۔۔۔ اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اسی احساسِ محرومی کی پرزور ترجمانی کی تھی، ذوالفقار علی بھٹو نے جس نے پاکستان کی سیاست کے اس نئے اور زوردار عوامی دھارے کو جنم دیا تھا جس کی ایک طوفانی لہر پر سوار ہوکر وہ اب سے پندرہ سال قبل خود ایوانِ اقتدار تک پہنچے تھے!

واضح رہے کہ اس وقت مجھے نہ بھٹو صاحب کی ذات اور شخصیت سے کوئی بحث ہے نہ ان کی سیرت و کردار سے، اور نہ ان کے خلوص یا عدمِ اخلاص کے بارے میں کوئی گفتگو کرنی ہے، نہ ان کی اہلیت یا نا اہلیت کے بارے میں کوئی فیصلہ دینا ہے بلکہ فی الوقت میری گفتگو صرف اور صرف پاکستان کی عوامی سیاست کے درمیانی دھارے کے اس INNER CORE کی تعیین و تشخیص سے متعلق ہے جس نے اس میں وہ قوت و مقاومت پیدا کردی ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے طویل ترین مارشل لاء سے بھی اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی۔ چنانچہ مارشل لاء کے ذرا پس منظر میں جاتے ہی اس کی طوفانی لہر سامنے آگئی۔ اگرچہ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ اس بار اس پر سواری بھٹو مرحوم کی صاحبزادی

مس بے نظیر کرتی ہیں یا ان کے سابق رفیق کار مسٹر جتوئی، یا ان کی ایک نظربندی کے دوران ان کے خلا کو پر کرنے والے ائر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان۔۔۔یا کوئی اور!!

بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ اس دھارے کے بہاؤ کو روکنا نہ کسی چوتھے مارشل لاء کے لیے ممکن ہے نہ پانچویں کے، اور اس کے آگے نہ علماء کرام کوئی بند باندھ سکتے ہیں نہ مشائخ عظام، نہ پشتینی رئیس اس کی راہ میں

مزاحم ہوسکتے ہیں نہ نو دولتیے سرمایہ دار، نہ سردار اور وڈیرے اس کا راستہ روک سکتے ہیں نہ زمیندار و جاگیر دار۔۔۔ اور نہ کوئی میر اس کے راستے میں حائل ہوسکتا ہے نہ کوئی پیر۔۔۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ اس کے رخ کو موڑنے کی کوشش کی جائے !

اس لیے کہ مغرب کی اندھی تقلید میں ہمارا یہ 'ڈان' بھی خالص مادیت ہی کے رخ پر بہہ رہا ہے اور اس کے 'INNER CORE' کا سارا خارجی لبادہ یورپ سے مستعار لیا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا کوئی براہ راست سروکار نہ اللہ سے ہے نہ رسول سے اور اس میں نہ ہدایتِ آسمانی سے کوئی اعتناء ہے نہ آخرت کی جوابدہی کا کوئی ذکر، لہٰذا عدلِ اجتماعی کے جملہ تصوّرات و معیارات بھی مغرب ہی سے ماخوذ ہیں اور ان کے ضمن میں افراط و تفریط کی انتہاؤں کے مابین بھٹکنے کی کیفیت بھی لامحالہ وہیں کا چربہ ہے۔۔۔ مزیدِ برآں ان کے جلو میں بے پردگی بھی ہے اور عریانی بھی، اباحیت (PERMISSIVENESS) بھی ہے اور آوارگی بھی، لاف زنی بھی ہے اور بڑکیں بھی، بھنگڑہ بھی ہے اور "ہے جمالو" بھی۔' اور ان سے بھی بڑھ کر عبادات سے بے اعتنائی ہی نہیں، ان کا استہزاء و تمسخر ہے' شریعت سے بے پروا ہی نہیں اس کے خلاف نشوز اور بغاوت ہے اور شعائر اسلامی کا عدمِ احترام ہی نہیں ان کی باضابطہ توہین و تذلیل ہے۔ و قس علی ذلک!

فکر اقبال کی روشنی میں اس صورتِ حال کا علاج بھی اس کی کلی نفی

(TOTAL NEGATION) اور بحیثیت مجموعی رد کردینے (TOTAL REJECTION) میں نہیں بلکہ اس کے صحیح جزو کو قبول کرتے ہوئے غلط جزو کی اصلاح میں مضمر ہے !

بالکل ایسے جیسے حضرتِ علامہ نے موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو ایک ایسے نیام سے تشبیہہ دی ہے جس میں سے ایمان باللہ کی تلوار نکال لی گئی ہو ؎

عشق کی تیغِ جگردار اڑالی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی !

گویا نیام تو اپنی جگہ درست اور کارآمد ہے، ضرورت صرف اس کی ہے کہ اس میں تلوار داخل کی جائے اسی طرح علمِ جدید میں فی نفسہٖ کوئی شے غلط نہیں ہے اور کائنات کے بارے میں معلومات کا جو عظیم خزانہ اس نے جمع کیا ہے وہ اپنی جگہ متاعِ بے بہا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس میں خالقِ کائنات کی معرفت و محبت کی چاشنی گھول دی جائے !

یہی وجہ ہے کہ حضرت علامہ نے اپنے اس مشہور اور متنازعہ فارمولے میں کہ :

"MARKXISM + GOD = ISLAM"

مغرب کے مادی فکر کی منطقی انتہا یعنی جدلی مادیت اور اس کے بھی نقطۂ عروج یعنی مارکسزم تک کو بالکلیہ رد نہیں کیا بلکہ صرف اس ضرورت کا احساس دلایا ہے کہ اس میں ایمان باللہ کا تریاق شامل کردیا جائے تو اس کی سمیت اور زہر ناکی ختم ہوجائے گی اور یہ اسلام کے بہت قریب آجائے گا !

بنا بریں فکر اقبال کی روشنی میں اس وقت 'کرنے کا اصل کام' یہ ہے کہ پاکستان کی عوامی سیاست کے عظیم دھارے کے آگے بند باندھنے کی لا حاصل ہی نہیں حد درجہ مضر اور خطرناک کوشش کی بجائے اس میں ایمان و یقین کی چاشنی اور حکمت و معرفت کی روشنی شامل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس طرح فی الجملہ اس کے رخ کو آسمانی ہدایت کی جانب موڑ دیا جائے !

اور یہ کام، ظاہر ہے کہ، ہرگز آسان نہیں بلکہ نہایت مشکل اور مشقت طلب ہے، البتہ

اس کے ضمن میں ایک بہت اہم اور مؤثر کردار ادا کرسکتے ہیں وہ لوگ جو اقبال کے مداح و شیدائی اور ان کے فکر و فلسفہ اور حکمت و بصیرت سے فیض حاصل کرنے والے اور خود کو ان کی جانب منسوب کرنے والے ہیں۔ اس لیے کہ اقبالؔ کے متذکرہ بالا فارمولے کے مانند ایک بظاہر نہایت سادہ لیکن بباطن حد درجہ محکم فارمولا یہ بھی ہے کہ:

"پاکستان کی بقا اور استحکام صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے اور احیاء اسلام کا واحد ذریعہ ہے تجدید ایمان اور ایمان کا واحد منبع اور سرچشمہ ہے قرآن حکیم اور دورِ حاضر میں احیاء قرآن کا ایک نہایت اہم اور مؤثر ذریعہ ہے فکر و کلامِ اقبال !"

اس لیے کہ جیسے کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے اور علی وجہ البصیرت کہا ہے اور آج پھر کہہ رہا ہوں اور ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہوں کہ عہدِ حاضر کے ذہنی و فکری ظروف و احوال میں قرآن حکیم کی عظمت کا جس قدر انکشاف اقبالؔ پر ہوا، اور کسی پر نہیں ہوا۔۔۔ اور موجودہ دور کی اعلیٰ ترین علمی و فکری سطح پر قرآن کے علم و حکمت اور ہدایت و معرفت کی تعبیر و تبیین اور تشریح و توضیح کی ہے صرف ۔۔۔۔ اور صرف اقبالؔ نے !

لیکن اس کے لیے اقبالؔ کے مداحوں اور شیدائیوں کو ع "پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے" کے مصداق کردار اور عمل کے میدان میں اترنا ہوگا۔ اور حلقہ اقبال کو محض ایک روایتی اور ثقافتی طائفے کی صورت اختیار کرنے بلکہ شدتِ احساس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مزارِ اقبال کے مجاوروں کی حیثیت اختیار کرنے کی بجائے خود اقبال لی "خانقاہ" سے بھی باہر نکل کر "رسمِ شبیری" ادا کرنی ہوگی ! اور اس کے لیے انہیں اس ہمت و جرات، محنت و مشقت، ایثار و قربانی اور بے نفسی و بے غرضی کے علاوہ، جو کسی بھی عظیم مقصد کے لیے لازمی ولابدی ہیں،

حسبِ ذیل عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔
۱۔ اولاً جس دین و شریعت کے نام لیوا اور علمبردار ہیں اس پر خود عمل پیرا ہونا اور اگر

جان کی امان پاؤں تو عرض کروں گا کہ اقبال کے مداحوں اور شیدائیوں کے لیے سب سے مشکل اور کٹھن مرحلہ یہی ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے خود اقبال کی 'بے عملی' کو 'سند' کا درجہ دے دیا ہے۔ حالانکہ قطع نظر اس سے کہ خود حضرتِ علامہ نے اپنی بے عملی اور 'تن آسانی' کا ہمیشہ ایک کمی کی حیثیت سے برملا اعتراف کیا اور اسے کبھی سند کی حیثیت سے پیش نہیں فرمایا، ان کے فکر کے علو و عظمت کے پیش نظر ان کی 'بے عملی' کی کوئی اہمیت نہیں رہتی بلکہ بلا مبالغہ مجھ ایسے لاکھوں انسانوں کا 'عمل' ان کی 'بے عملی' پر نچھاور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسرا کون ہے جو اس کا مدعی بن کر سامنے آسکے؟ مولانا مودودی مرحوم نے تو حضرت علامہ کو صوفیا کے 'ملامتیہ' سے متعلق قرار دیا ہے جو اپنے 'عمل' کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپانے کے لیے 'بے عملی' کا مظاہرہ کرتے ہیں، میں یہاں تک بھی نہیں جاتا بلکہ اسے اس قاعدہ کلیہ کے ذیل میں شمار کرتا ہوں کہ نابغہ لوگوں کا عمل بالعموم ان کے فکر کا ساتھ نہیں دے سکتا، تاہم اصل بات یہ ہے کہ حضرتِ علامہ ہمیں وہ فکر دے گئے جو اس دور کے لاکھوں نہیں کروڑوں 'با عمل' لوگ بھی نہیں دے سکتے تھے لیکن اب اس فکر کو عملاً بروئے کار لانے کا اوّلین تقاضا ع

"شرطِ اوّل قدم ایں ست کہ مجنوں باشی"

کے مصداق اس اسلام پر بالفعل عمل پیرا ہونا ہے جس کی تعبیر حضرت علامہ نے یوں فرمائی کہ ع

"عاشقی محکم شو از تقلیدِ یار"۔

اس ضمن میں اس مغالطے پر مستزاد جس تضاد کا مظاہرہ علامہ مرحوم کے حلقہ بگوشوں میں نظر آتا ہے اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ بالفرض وہ داڑھی اس لیے نہیں رکھتے کہ علامہ نے نہیں رکھی تو اسی دلیل کے تحت اپنے گھروں میں پردہ کیوں رائج نہیں کرتے حالانکہ اس موضوع پر حضرت علامہ کے افکار و آراء بھی نہایت واضح اور روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں اور ان کا عمل تو اس سے بھی کہیں زیادہ روشن و تابناک ہے! اس ضمن میں اس وقت مزید کچھ عرض کرنے سے اس لیے گریز کرتا ہوں کہ اس دور میں حضرت علامہ کے اس شعر کا مصداقِ کامل میں ہوں کہ:

؎ کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند !

تاہم یہ صرف ایک مثال ہے۔ ؎ "قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"
۲۔ثانیاً اس عظیم مقصد کے لیے علماء کرام کا تعاون حاصل کیا جائے

اور اس ضمن میں حضرتِ علامہ کی ان تنقیدوں اور لطیف اور مزاحیہ انداز کی ان پھبتیوں کے ساتھ ساتھ جو انہوں نے روایتی ملا پرچست کی ہیں ان کے اس طرز عمل کو نگاہ میں رکھا جائے کہ انہوں نے ہمیشہ علماء حق کا احترام کیا۔ یہاں تک کہ اپنے تمام تر مرتبۂ علمی و فکری کے باوجود بالغ نظر اور وسیع الذہن علماء سے خالص طالب علمانہ انداز میں کسبِ فیض میں کبھی اپنی توہین یا سبکی محسوس نہیں کی۔ چنانچہ علامہ سیّد سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالی کے ساتھ ان کی خط و کتابت اس پر شاہد عادل ہے۔

خصوصاً فقہ و قانونِ اسلامی کے ضمن میں اس دور میں اجتہاد کے سب سے بڑے داعی اور علمبردار ہونے کے باوجود، انہوں نے خود اپنے آپ کو کبھی مجتہد مطلق نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کے باوجود کہ عربی زبان پر انہیں عبور حاصل تھا، قرآن ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا اور خود وہ تمام عمر قرآن میں غوطہ زنی کرتے رہے تھے، حکمتِ دین ان کے ذہن و فکر کی جزو لاینفک تھی اور تفقہ فی الدین ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ 'قانونِ اسلامی کی تدوینِ نو کے ضمن میں انہیں کبھی یہ خیال تک نہیں آیا کہ وہ تن تنہا اس کے اہل ہیں، بلکہ کسے معلوم نہیں کہ وہ اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری ایام تک بیہقیٔ وقت مولانا سیّد محمد انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ تعالی سے درخواست فرماتے رہے کہ وہ کسی طرح لاہور منتقل ہوجائیں تو دونوں مل کر وقت کی اس اہم ترین ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کی کوششیں کریں۔

اس ضمن میں قدیم اور جدید کے امتزاج کی جس قدر فکر اور خواہش حضرت علامہ کو تھی اسی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ مولانا سید ابو الاعلی مودودی مرحوم و مغفور کی تحریروں میں اس امتزاج کی جھلک دیکھ کر حضرت علامہ نے انہیں دکن کی سنگلاخ زمین سے ہجرت کرکے پنجاب آنے کی دعوت دی اور اپنے ایک عقیدت مند چودھری نیاز علی مرحوم کے ذریعے پانچ دریاؤں کی سرزمین ان کے 'تمکن' کی سبیل پیدا فرمائی۔۔۔ مجھے حضرت علامہ کے اس اقدام

کا پس منظر نظر آتا ہے ان کے اس قطعے میں جو آج بھی ان کے مرقد کی زینت بنا ہوا ہے کہ ؎

بای تا کارِ ایں امت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر
ولے در سینۂملا گدازیم

لیکن افسوس کہ مولانا مرحوم نے برّ صغیر کے مسلمانوں کی قومی جدوجہد کے نقطۂ عروج کے آغاز پر تو یہ کہہ کر قومی سیاست سے علیحدگی اختیار کرلی تھی کہ 'میں مسلمانوں کا نہیں صرف اسلام کا کام کرنا چاہتا ہوں'۔۔۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد 'اسلام کے کام' کے لیے قومی ہی نہیں خالص سیاسی راستہ اختیار کرلیا۔ اس پر تو اس وقت میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ کاش کہ ایسا نہ ہوتا ! اور مولانا مرحوم قیام پاکستان کے بعد بھی اپنے سابق انقلابی طریق کار ہی پر عمل پیرا رہتے ، تاہم فکرِ اقبال کے شیدائیوں کی توجہ اس جانب مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس چیز کی اہمیت حضرت علامہ کو اس وقت محسوس ہوئی تھی وہ آج بھی نہایت اہم ہے ! اور قدیم و جدید کے محکم امتزاج اور علماء حق کے تعاون و اشتراک کے بغیر پاکستان کی قومی سیاست کے دھارے کے رخ کو اسلام کی جانب موڑنا ناممکن ہے۔

آخر میں جملہ شرکاء مجلس سے طویل سمع خراشی کے لیے معذرت خواہی کے ساتھ ساتھ کارکنان مرکزیہ مجلسِ اقبالؔ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے 'مجلس اقبال' میں شرکت کی دعوت دے کر میرا اعزاز و اکرام بھی فرمایا۔۔۔ اور مجھے یہ موقع بھی عنایت فرمایا کہ اپنا دردِ دل ایسے منتخب روزگار حضرات کی محفل میں بیان کرسکوں اور واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین کے مطابق سب سے آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں اللہ کا کہ اس نے مجھے بھی تین دن کی مختصر مدت کے اندر اپنے خیالات کو قلمبند کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور میرے ساتھیوں کو بھی ہمت دی کہ اسی قلیل عرصہ میں اس کی طباعت کا مرحلہ طے کرلیا۔ اگر ہم سے کوئی خیر بن آئے تو یہ سب اللہ ہی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ اور خطا ہوتی ہے تو وہ ہمارے نفوس کی شرارت سے۔ اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔

حیات و سیرتِ اقبال
فلسفۂ اقبال

اور
ملتِ اسلامیہ کے نام
اقبال کا پیغام
از
پروفیسر یوسف سلیم چشتی

تعارف

از قلم: ڈاکٹر اسرار احمد

پروفیسر یوسف سلیم چشتی ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہیں ایک طویل عرصے تک علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں حاضری کا موقع مسلسل ملتا رہا۔ ۱۹۳۳ء میں جبکہ علامہ اقبال مرحوم بقیدِ حیات ہی تھے پروفیسر صاحب نے "اقبال کا پیغام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ابتداءً علامہ کے سوانح حیات اور ان کی سیرت کا ایک اجمالی خاکہ دیا گیا تھا اور پھر علامہ کے فلسفے کے اجمالی تعارف کے لیے اوّلاً ان کی اس تحریر کا ترجمہ کیا گیا تھا جو انہوں نے پروفیسر نکلسن کی فرمائش پر اپنے فلسفیانہ افکار کی وضاحت کے لیے خود لکھی تھی اور ثانیاً 'پیغام اقبال' کے مختصر لیکن جامع تعارف کے طور پر 'مثنوی اسرار و رموز' کے مباحث کا خلاصہ مرتب کیا گیا تھا۔' پروفیسر صاحب کی ان گنت تحریروں کی طرح یہ تحریر بھی مسودات کے انبار میں دبی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب اپنے کسی اور مضمون کی تلاش میں مسودات کی ورق گردانی کر رہے تھے کہ اتفاقاً یہ سامنے آگئی جو انہوں نے راقم کو مرحمت فرما دی۔

اس تحریر کا اصل حصہ علامہ مرحوم کے فلسفیانہ افکار اور ان کے اس پیغام پر مشتمل ہے جو انہوں نے

ملت اسلامی کو دیا ہے۔ تاہم حیات و سیرتِ اقبال کا اجمالی خاکہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ علامہ مرحوم کی زندگی پر بہت مفصل کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں اور ان کی زندگی کے اہم واقعات تو اکثر لوگوں کے ذہن میں ویسے بھی محفوظ ہیں، تاہم اس اعتبار سے یہ تحریر بہت دلچسپ اور قدرے منفرد حیثیت کی حامل ہے کہ یہ علامہ کی زندگی ہی میں ان کے ایک حلقہ بگوش اور عقیدت مند کے قلم سے نکلی تھی۔ خود علامہ مرحوم کے علاوہ ان کے والد ماجد، اساتذہ کرام اور ہم عصر مفکرین پر جو نوٹ ضمناً اس مضمون میں آ گئے ہیں ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور ان سے اس مضمون کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس مضمون کو پڑھتے ہوئے یہ امر ذہن میں مستحضر رکھا جائے کہ یہ ۱۹۳۳ء میں لکھا گیا تھا۔ چنانچہ بہت سی باتیں جو اس مضمون میں بصیغۂ حال بیان ہوئی ہیں کب کی قصۂ ماضی بن چکیں۔ چنانچہ کہیں کہیں انسان ایک دم چونک سا جاتا ہے۔ اس میں ایک خزانہ عبرت پنہاں ہے ع "جو تھا نہیں، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرف محرمانہ"

(ماخوذ از یثاق بابت مئی ۱۹۶۹ء)

حیات و سیرت اقبال
ایک اجمالی خاکہ

علامۃ العصر ترجمان حقیقت ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال مدظلہٗ کے آباؤ اجداد کشمیری پنڈت تھے۔ جن کی گوت "سپرو" تھی وہ ایک باکمال ولی اللہ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے تھے اور اس ولی کا روحانی تصرف آج تک ان کے خاندان میں چلا آتا ہے اور وہ حسنِ عقیدت جس نے سپرو کو شیخ بنا دیا، ہنوز تازہ ہے۔ اقبال نے خود بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اسی لیے اقبال کو کشمیر اور کشمیریوں دونوں سے قدرتی طور پر لگاؤ ہے چنانچہ ان کے کلام میں دونوں کے متعلق رموز و نکات موجود ہیں۔ مثلا:

کشیری کہ بابندگی خوگرفتہ
بتے می تراشد ز سنگ مزارے

ڈاکٹر صاحب ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے تھے۔ والدین نے اقبال نام رکھا *
میرا خیال ہے اس وقت کس کو یہ خیال ہوگا کہ آئندہ چل کر یہ لڑکا واقعی صاحب اقبال ہوگا اور ایک مثنوی ایسی لکھ کر دنیا کو دے جائے گا، جس کی قدر و قیمت قیامت تک باقی رہے گی۔ _____ * حاشیہ کے لیے صفحہ ۱۰۳ ملاحظہ فرمائیے۔ قارئین کی سہولت کے پیش نظر تمام حواشی ان مضامین کے اختتام پر جمع کردیے گئے ہیں۔

ابتداء ! مکتب میں داخل ہوئے اس کے بعد سکول میں نام لکھا یا اور مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے میٹرک پاس کرکے مقامی (مرے کالج) میں داخل ہوئے۔ یہاں آپ کو شمس العلماء مولانا سید میر حسن صاحب ۲؎ کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ استاد کو جوہر قابل ہاتھ لگ گیا۔ فیض صحبت سے چمکا دیا، ادب اور شاعری کا صحیح مذاق پیدا کردیا۔ یہ سچ ہے کہ شاعری کا ملکہ فطری طور پر ودیعت شدہ تھا۔ لیکن مولانا کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔
غالباً شاعری کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی۔ افسوس کہ ابتدائی کلام النادر کالمعدوم کا مصداق ہے۔
ایف اے پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ فلسفہ اور عربی لے کر بی اے پاس کیا۔ ۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم اے پاس کیا۔ اس امر کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں کہ علامہ موصوف شروع سے آخر تک ہم چشموں میں معروف اور ممتاز رہے۔
اسی سال آپ اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور اقتصادیات کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ دوسرے سال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوگئے۔
جس طرح ابتدا میں مولانا میر حسن نے، اسی طرح طالب علمی کے آخری دور میں ڈاکٹر آرنلڈ ۳؎ کی صحبت نے آپ کی مخفی قوتوں کو بیدار کردیا اور سونے کو کندن بنا دیا۔ پہلے شاگردی تھی، کچھ عرصہ کے بعد دوستی کا سلسلہ قائم ہوگیا جو مدۃ العمر باقی رہا۔ آرنلڈ اپنے شاگرد کی جودتِ طبع کے معترف تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ "جس استاد کو اقبال سا شاگرد میسر آجائے، وہ رفتہ رفتہ محقق بن جاتا ہے"۔
ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی آپ کے مطالعہ اور علمی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اور زیادتی ہوگئی۔ اسی

اثنا میں آپ نے اقتصادیات پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔
۱۹۰۵ء میں آپ ولایت تشریف لے گئے [۴]
۔ کیمبرج سے فلسفہ اخلاق میں ڈگری

لی۔ اس کے بعد میونخ سے DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA لکھنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی پھر لندن واپس آئے۔ بیرسٹری پاس کی اور ڈاکٹر آرنلڈ کی غیر حاضری میں چھ ماہ تک ان کے قائم مقام کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بھی رہے۔

تین سال قیام کرنے کے بعد ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز دو شنبہ شام کی گاڑی سے لاہور واپس آئے۔ دورانِ قیام انگلستان میں آپ کو مشاہیر علماء اور فضلاء کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔ ان میں کیمبرج کے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ ، [۵]
ڈاکٹر براؤن [۶]
،ڈاکٹر نکلسن [۷]
اور ڈاکٹر سارے [۸]
خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔
کچھ دن وطن میں قیام کرنے کے بعد آپ نے لاہور میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی۔ پہلے انار کلی میں رہائش تھی۔ اب ایک عرصہ سے میکلوڈ روڈ پر قیام [۹]
ہے۔۔ اقبال کی وجہ سے مجھے اس سڑک سے وہی وابستگی ہے ۔ جو مجنوں کو کوئے لیلی سے تھی۔
۱۹۳۳ء میں جاوید منزل۔۔۔۔ ۱۹۳۸ء میں وفات ۔

اگرچہ ڈاکٹر صاحب ۱۹۰۸ء سے پریکٹس کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں اس پیشہ سے کوئی خاص دلچسپی کبھی نہیں ہوئی۔ اور ہوتی بھی کیونکر۔ جو شخص دن رات کسی دوسرے عالم میں رہتا ہو اور شاعرانہ دل و دماغ، فلسفیانہ مزاج، صوفیانہ افتادِ طبع اور عالمانہ طرز زندگی رکھتا ہو، جو VISIONARY IDEALIST ہو۔ جس کی توجہ تمام تر ملت اسلامیہ کی بہبود پر مبذول رہتی ہو۔ جس کے دل میں قوم کا درد رہ رہ کر چٹکیاں لیتا ہو جو سراپا سوز و گداز ہو جس کا بہت سا وقت EGO اور REALITY کے متعلق غور و فکر میں بسر ہوتا ہو۔ جو اسرارِ خودی کا مصنف ہو اسے "نظائر دیوانی" اور "امثلہ فوجداری" سے کیا خاک دلچسپی ہو سکتی ہے؟

۱۹۳۳ء میں سرکار برطانیہ نے آپ کو SIR کا خطاب دیا ۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی خطابات یا اعزازات کے لیے خواہش یا کوشش نہیں کی اور نہ وہ اس خطاب کو کسی

خاص قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ کسی دوسری دنیا میں رہتے ہیں جہاں SIR اور SERVANT دونوں یکساں نظر آتے ہیں ؎

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اقبال کی شاعری

یوں تو شاعر، ماں کے پیٹ سے شاعر بن کر آتا ہے۔ لیکن جس وقت یہ ملکہ ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے شاعر کی شاعری کا آغاز تصور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کی شاعری کا آغاز ۱۸۹۵ سے سمجھنا چاہیے۔ اس زمانہ میں اور اس سے پہلے آپ کی سخن گوئی صرف احباب اور کالج کے طلبہ تک محدود تھی۔ لیکن ۱۸۹۶ء میں آپ نے جلسوں میں شرکت شروع کی اور اس طرح آپ کی خداداد قابلیت کا شہرہ عام ہونے لگا۔

غالبا ! دوستوں نے مشورہ دیا ہوگا کہ آپ کو کسی باکمال استاد سے مشورہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ استاد بہرحال، خوب کو خوب تر بنا دیتا ہے یا آپ نے خود اس ضرورت کو محسوس کیا ہوگا۔ بہرکیف آپ نے بلبل ہند نواب فصیح الملک بہادر، مرزا داغ دہلوی، استاد اعلی حضرت نظام دکن مرحوم کو خط لکھا کہ مجھے اپنی سلک شاگردی میں منسلک کرلیجیے اور چند غزلیں بھی اصلاح کے لیے بھیجیں۔

تلمذ کا یہ سلسلہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ ہاں بقول آنریبل جسٹس شیخ سر عبدالقادر صاحب بالقابہ "اس کی یاد دونوں طرف باقی رہ گئی"۔ اقبال کی خوش نصیبی کہ اسے داغ جیسا زبان دان اور کامل الفن استاد ملا، اور داغ کی بلند بختی کہ اقبال اس کے شاگردوں کی ممتاز صف میں شامل ہوا۔ شیخ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام پر انہوں نے اصلاح دی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سنے۔

اقبال نے خود بھی ایک غزل کے مقطع میں داغ کے شاگرد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

نسیم تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

سب سے پہلے لاہور میں، سب سے پہلے مشاعرہ میں آپ نے جو غزل پڑھی اس کا مقطع یہ ہے:۔

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو شعراء قوموں کو زمزمہ حیات سنانے آتے ہیں وہ مکانی اور زمانی دونوں قیود سے آزاد ہوتے ہیں۔ اقبال نے رفتہ رفتہ اپنی طرز وہی کرلی جو ان کے لیے مناسب تھی۔ یعنی ۱۹۱۱ء سے اقبال کی شاعری اسلامی شاعری ہوگئی۔ ٦ اکتوبر ۱۹۱۱ کو بادشاہی مسجد لاہور میں آپ نے "خون شہداء کی نذر" کے عنوان سے جو نظم پڑھی، اس نے ایک قیامت برپا کردی۔ جس وقت آپ نے یہ شعر پڑھا

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مسجد میں کہرام مچ گیا تھا۔ آنچہ از دل می خیزد بر دل می ریزد۔ والا مضمون ہے ہر آئندہ نظم سوز درونی کی آئینہ دار ہے۔

اقبال کی سیرت

علامہ موصوف کو دیکھنے اور ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا بارہا شرف حاصل ہوچکا ہے ۱۰ ے۔ اس لیے جو کچھ لکھتا ہوں وہ میرے ذاتی خیالات ہیں۔ ان سے مل کر جو نقوش دل پر جم چکے ہیں انہیں الفاظ کا جامہ پہناتا ہوں۔

پہلی بات جو ہر شخص کو متاثر کرتی ہے وہ ان کی عدیم النظیر سادگی ہے۔ سادہ لباس، سادہ رہائش، سادہ زندگی، سادہ گفتگو غرضیکہ ہر بات سے سادگی ٹپکتی ہے۔ لیکن دماغ ہر وقت

آسمان کے تارے توڑ کر لاتا رہتا ہے۔ اسی کو انگریزی میں کہتے ہیں PLAIN LIVING AND HIGH THINKING

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ کا در فیض ہر کس و ناکس کے لیے آٹھوں پہر کھلا رہتا ہے۔ اگر نائٹوں اور خان بہادروں کو بآسانی باریابی ہوجاتی ہے تو ہم جیسے خاک نشین بھی بے دھڑک السلام علیکم کہہ کر خوان علم و فضل کی زلہ ربائی کا شرف حاصل کرلیتے ہیں "صاحب" کے پاس کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ شہرت سے مستغنی ہیں۔ اگر وہ آجکل کے مروج اصول "پروپاغندا" کو استعمال کرتے، تو بہت شہرت حاصل کرلیتے۔ ان کا وقت زیادہ تر ملت اسلامیہ کی بہبود کی تدابیر سوچنے میں بسر ہوتا ہے۔ شہرت اور منزلت یوں بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ بلاشبہ بین الاقوامی شہرت اور منزلت کے آدمی ہیں۔ ایشیاء، یورپ ، افریقہ اور امریکہ ، اقبال کے مداح کہاں نہیں ہیں؟ ع

شہرت شعرش بگیتی بعد او خواہد شدن

چوتھی بات یہ ہے کہ اقبال اپنے سینہ میں سوز و گداز سے لبریز دل رکھتے ہیں۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ کسی نکتہ کو سمجھاتے سمجھاتے بے اختیار آبدیدہ ہوجاتے ہیں۔ سرکار دو عالم ﷺ سے جو عشق ہے اس کی نظیر ابھی تک تو کسی " گیسودراز" میں دیکھی نہیں ! ! !

یوں تو ہر شاعر پرکیف ہوتا ہے۔ سوز و گداز سے لبریز ہوتا ہے۔ لیکن اقبال سوزِ عشق مصطفٰے سے مالا مال ہیں اسی لیے مجھے ان سے ایک عجیب والہانہ عقیدت ہے۔

حب رسول کے لیے نہ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ چاہیے نہ طویل اللحیہ اور قصیر الشارب ہونے کی ضرورت ہے۔ صرف درد آشنا دل درکار ہے ۱۱ ؎۔

پانچویں بات یہ ہے کہ وہ تنہائی پسند اور عزلت گزیں ہیں اور ایک مفکر کے لیے یہ بات عجیب و غریب نہیں۔

علامہ موصوف کو اپنی والدہ مرحومہ سے بہت الفت تھی اور میری ان سے عقیدت کی

یہ دوسری وجہ ہے کیونکہ اگر اسلام میں خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں خود اپنی والدہ کی پرستش کرتا انہوں نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جو نظم لکھی ہے وہ ان کے جذبات محبت کی قدرے ترجمانی کرتا ہے۔

علامہ کی تصنیفات

(۱)۔ علم الاقتصاد اردو نایاب ہے
(۲)۔ فلسفہ ایران انگریزی مل سکتی ہے
(۳)۔ اسرارِ خودی فارسی مل سکتی ہے
(۴)۔ رموزِ بے خودی فارسی مل سکتی ہے
(۵)۔پیامِ مشرق فارسی مل سکتی ہے
(٦)۔ زبور عجم فارسی مل سکتی ہے
(۷)۔ لکچرز مدراس انگریزی مل سکتی ہے
(۸)۔ جاوید نامہ فارسی مل سکتی ہے
(۹)۔ بانگ درا اردو مل سکتی ہے
(۱۰)۔ بال جبریل اردو مل سکتی ہے
(۱۱)۔ ضرب کلیم اردو مل سکتی ہے
(۱۲)۔ مسافر فارسی مل سکتی ہے
(۱۳)۔ "پس چہ باید کرد" فارسی مل سکتی ہے
(۱۴)۔ ارمغان حجاز فارسی و اردو مل سکتی ہے

قدر دانی

عام قاعدہ تو یہ ہے کہ شعراء ، حکماء، فلاسفہ کی قدر ان کے بعد ہوتی ہے۔ لیکن اقبال کی شہرت ان کی زندگی ہی میں کافی ہوچکی ہے۔
(۱)۔ ترکی زبان میں، عربی زبان میں اور انگریزی زبان میں ان کی بہت سی نظموں کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ ڈاکٹر نکلسن نے اسرارِ خودی کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔ کئی جرمن علماء نے علامہ کے کلام اور فلسفہ پر تبصرہ جرمن زبان میں شائع کیا ہے۔ ان کے علاوہ یورپ کی مختلف زبانوں میں، ان کے فلسفہ پر محققانہ مضامین لکھے گئے ہیں۔
(میثاق مئی ۱۹۶۹ء)

فلسفۂ اقبال

علامہ اقبال مرحوم بلاشبہ ایک عظیم شاعر ہی نہیں، بہت بڑے فلسفی بھی تھے۔ ان کے فلسفہ کو عام طور پر "فلسفۂ خودی" کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ ان کا اصل فلسفہ ہے کیا:

یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ علامہ کی معرکۃ الآراء مثنوی "اسرار خودی" کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے کیا ہے۔ لیکن یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں کہ پروفیسر موصوف نے خود "اسرار خودی" کو سمجھنے کے لیے اوّلاً ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم سے مدد لی جو اس وقت کیمبرج میں اپنے تحقیقی کام میں مصروف تھے (یہ ذکر ۱۹۱۸ء کا ہے) اور پھر جب اس ساری تگ و دو کے باوجود وہ علامہ مرحوم کے فلسفہ کو اچھی طرح نہ سمجھ پائے تو انہوں نے خود علامہ سے رجوع کیا اور فرمائش کی کہ وہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو ایک مختصر لیکن جامع مضمون کی صورت میں بزبان انگریزی تحریر کردیں۔ علامہ نے اس فرمائش کی تعمیل میں جو مضمون لکھا اسے پروفیسر نکلسن نے "Secrets of the Self" کے شرع میں شامل کردیا جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

ذیل میں ایک تو اس تحریر کا وہ ترجمہ درج کیا جا رہا ہے جو پروفیسر چشتی صاحب نے ۱۹۳۲ء میں کیا تھا اور دوسرے مثنوی اسرار خودی کا وہ خلاصہ بھی درج کیا جارہا ہے جو پروفیسر صاحب نے اسی زمانے میں خود مرتب

لیا تھا۔ مزید برآں "رموز بے خودی" کا خلاصہ بھی آئندہ صفحات میں قارئین کی نظر سے گزرے گا، اسے بھی پروفیسر صاحب نے اسی زمانے میں مرتب کیا تھا۔

اس طرح یہ مضمون نہ صرف یہ کہ علامہ اقبال کے فلسفے پر نہایت مختصر لیکن انتہائی جامع اور ساتھ ہی غایت درجہ عام فہم دستاویز کی صورت اختیار کرگیا ہے۔ بلکہ اس کے ذریعے اس پیغام کا خلاصہ بھی سامنے آجائے گا جو علامہ مرحوم نے امت مسلمہ کو دیا تھا اور یہ تینوں مضمون مل کر ایک مکمل وحدت کی صورت اختیار کرلیں گے۔ واضح رہے کہ 'رموز بے خودی' کا ترجمہ بعد میں پروفیسر آربری نے کیا جو ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ ۔۔۔۔۔ اسرار احمد (یثاق، جون ۱۹۶۹ء)

* * *

۔۔۔۔۔۔(۱)۔۔۔۔۔۔
اقبال کے فلسفہ کا اجمالی خاکہ
جو انہوں نے نکلس کی فرمائش پر خود تحریر فرمایا

ترجمہ: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

ہر موجود میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ حیات تمام و کمال انفرادی ہے۔ خود خدا بھی اک فرد ہے۔ اگرچہ فرد کامل ہے۔ کائنالت افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن مجموعہ میں جو نظم و نسق اور توافق و تطابق پایا جاتا ہے وہ بذاتہٖ کامل نہیں ہے۔ اور جو کچھ بھی ہے وہ افراد کی جبلی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہمارا قدم تدریجی طور پر بدنظمی اور انتشار سے نظم و ترتیب کی طرف اٹھ رہا ہے۔ افرادِ کائنات کی تعداد معین نہیں ہے۔ اس میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔ یعنی کائنات فعل مختتم نہیں ہے۔ ہنوز مراتب تکمیل طے کر رہی ہے اسی لیے اس کے متعلق کوئی بات حتمی اور اذعانی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ فعل تخلیق ہنوز جاری ہے اور جس حد تک انسان اس

کائنات کے کسی غیر مربوط حصہ میں ربط و ترتیب پیدا کرسکتا ہے اس حد تک اس کو بھی فعلِ تخلیق میں معاون قرار دیا جا سکتا ہے۔ خود قرآن مجید میں خدا کے علاوہ دوسرے خالقوں کے امکان کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔ "فتبارک اللہ احسن الخالقین"

ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق یہ نظریہ ہیگل اور اس کے ہم خیالوں اور ارباب وحدت الوجود سے بالکل مختلف ہے جن کے خیال میں انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ خدایا حیات کلی میں جذب ہوجائے اور اپنی انفرادی ہستی مٹادے۔

میری رائے میں انسان کا اخلاقی اور مذہبی منتہائے مقصود یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے۔ یا اپنی خودی کو فنا کردے بلکہ یہ کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر بیش ازبیش انفرادیت پیدا کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ" یعنی اپنے اندر صفاتِ الٰہیہ پیدا کرو۔ پس انسان جس قدر خدا سے مشابہ ہوگا۔ اسی قدر اس کے اندر شان یکتائی اور رنگ انفرادیت پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

حیات کیا ہے؟ فرد کا دوسرا نام حیات ہے اور فرد کی اعلیٰ ترین صورت، جو اس وقت تک معلوم ہوسکی ہے خود (EGO) ہے۔ اگرچہ جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے انسان ایک مستقل بالذات مرکز ہے۔ لیکن ابھی تک فردِ کامل کے مرتبہ کو نہیں پہنچا۔ فرد جس قدر خدا سے قریب ہوگا۔ اسی قدر کامل ہوگا۔ قربِ الٰہی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہوجائے، بلکہ اس کے برعکس یہ کہ خدا کو اپنے اندر جذب کرلے۔ حیات در اصل اک ترقی کرنے اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے والی حرکت کا نام ہے۔ جو رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ان پر غلبہ پا کر آگے بڑھتی ہے۔ حیات کا خاصہ یا جوہر طبعی یہ ہے کہ مسلسل نئی آرزوئیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اپنی حفاظت اور ترقی کے لیے اس نے آلات اور وسائل پیدا کرلیے ہیں۔ مثلاً حواس اور ادراک جن کی بدولت وہ مشکلات پر غالب آتی ہے۔ مادہ حیات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن مادہ کوئی بری چیز نہیں۔ بلکہ حیات

کے حق میں مفید ہے کیونکہ اسی وجہ سے حیات کو اپنی مخفی قوتوں کے بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے۔

جب حیات یا خودی مشکلات پر غالب آجاتی ہے تو مرتبۂ جبر سے مرتبۂ اختیار پر فائز ہوجاتی ہے۔ خودی ایک حد تک مجبور ہے ایک حد تک مختار۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے "الایمان بین الجبر والاختیار" حیات جب تقرب الٰہی حاصل کرلیتی ہے تو اختیار کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر پہنچ جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ حیات یا خودی، مرتبہ جبر سے مرتبہ اختیار تک پہنچنے کا نام ہے۔

جب حیات انسانیت کا جامہ اختیار کرلیتی ہے تو اس کا نام ایغو یا شخص یا خودی ہو جاتا ہے اور

شخصیت جدوجہد کی مسلسل حالت سے عبارت ہے۔ شخصیت کا قیام اسی حالت کے تسلسل پر منحصر ہے اگر یہ حالت قائم نہ رہے تو لامحالہ تعطل یا ضعف کی حالت طاری ہوجائے گی اور یہ بات خودی کے حق میں سمِّ قاتل ہے۔۔۔ شخصیت (PERSONALITY) چونکہ انسان کا سب سے بڑا کمال ہے اس لیے اس کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ اس جوہر بے بہا کو مسلسل سرگرم عمل رکھے اور وہ عمل ایسا ہو کہ خودی کی ترقی کا باعث ہو۔ اسی کو مذہب کی اصطلاح میں "عمل صالح" کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن میں بار بار اس کی تاکید آئی ہے۔

مسلسل جدوجہد ہی زندگی ہے

(ع دوامِ ما زسوز نا تمام است)

جو شے شخصیت کو پیہم جدوجہد کی طرف راغب کرتی ہے وہ دراصل ہمیں بقائے دوام کے حصول میں مدد دیتی ہے اس لیے حسن یا اچھی ہے اور جو شے شخصیت کو ضعیف یا معطل کرے وہ بری ہے۔ گویا ہماری شخصیت جملہ اشیائے کائنات کے حسن و قبح کا معیار ہے۔ مذہب، اخلاق اور آرٹ سب کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے

PERSONALITY AS THE CRITERION OF VALUE

میں نے افلاطون کے فلسفہ پر جو تنقید کی ہے اس سے میرا مطلب ان فلسفیانہ مذاہب

کی تردید ہے جو بقا کے عوض فنا کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ یہ مذاہب انسان کو بزدلی سکھاتے ہیں۔ ان مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہیے۔ حالانکہ انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور انہیں اپنا خادم بنا لے۔ اس وقت انسان "خلیفۃ اللہ" کے مرتبے تک پہنچ جائے گا۔

جس طرح خودی کو مرتبۂ اختیار پر فائز کرنے کے لیے ہمیں "مادہ" پر غالب آنا ضروری ہے، اسی طرح اسے غیر فانی بنانے کے لیے ہمیں "زمانہ" پر غالب آنا لازمی ہے۔ مرتبۂ بقا وہی شخص حاصل کرسکتا ہے جو اس کے لیے جدوجہد کرے اور اس کا حصول ہمارے افکار و اعمال کے ان طریقوں پر منحصر ہے جو خودی کی حالتِ کاوش پیہم کو برقرار رکھ سکیں۔ بدھ مذہب اور ایرانی تصوّف اس حالت کے لیے مفید نہیں ہیں۔

اگر خودی کی حالتِ کاوش برقرار رہے تو گمان غالب یہ ہے کہ موت کا صدمہ ہماری خودی کو متاثر نہیں کرسکتا۔ ممکن ہے کہ موت موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک وقفہ سکون ہو جسے قرآن شریف عالمِ برزخ سے تعبیر کرتا ہے۔ موت کا صدمہ صرف وہ افراد برداشت کرسکیں گے جنہوں نے اس زندگی میں اپنی خودی کو پختہ کرلیا ہوگا۔

اگرچہ حیات اپنے ارتقائی منازل میں اعادہ اور تکرار کو پسند نہیں کرتی تاہم جیسا کہ ولڈن کار نے لکھا ہے حشرِ اجساد بھی عین قرینِ عقل ہے۔ زمانہ کو لمحات میں تقسیم کردینے سے ہم اسے مکان سے وابستہ کرسکتے ہیں اور اسی لیے اس کو عبور کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔

زمانہ کی حقیقت اس وقت آشکارا ہوسکتی ہے جب ہم اپنی ذات میں غوطہ زنی کریں کیونکہ حقیقی زمانہ خود ہماری حیات ہی ہے۔ ہم زمانہ کے محکوم اسی وقت تک ہیں جب تک زمانہ کو مکان سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ مقید بالمکان زمانہ، اس زنجیر سے مشابہ ہے جس کو کسی شخص نے اپنے گرد لپیٹ لیا ہو۔ اس زمانہ کو حیات نے اپنے گرد اس لیے لپیٹ لیا ہے تاکہ موجودہ ماحول کو اپنے اندر جذب کرسکے۔ دراصل ہم غیر زمانی ہیں۔ اور موجودہ مقیّد بالزمان زندگی میں بھی، کبھی کبھی

ہمیں اپنے غیر زمانی ہونے کا احساس ہوسکتا ہے۔ اگرچہ یہ بالکل 'آنی' ہوگا۔

خودی میں عشق سے پختگی پیدا ہوتی ہے۔ عشق کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے اندر جذب کرنا یا جزو ذات بنانا۔ عشق کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ ایک نصب العین اپنے سامنے رکھا جائے۔ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق اور معشوق دونوں میں شان انفرادیت پیدا کردیتا ہے۔

جس طرح عشوق سے خودی میں پختگی اور توانائی آتی ہے سوال سے ضعف اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ جو بات تمہیں ذاتی کوششوں کے بغیر حاصل ہوجائے وہ سوال کے ذیل میں آتی ہے۔ چنانچہ جو شخص باپ کے ترکہ سے دولت مند بنتا ہے وہ دراصل سائلِ یعنی گدا ہے۔ جو شخص دوسروں کے خیالات کو مدار فکر بناتا ہے، وہ بھی سائل ہے ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

عشق کس طرح کرنا چاہیے؟ اس کا جواب ایک مسلمان کے لیے آنحضرت ﷺ کی زندگی میں موجود ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ' "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" آپ نے اپنے طرزِ عمل سے دکھا دیا کہ عشق اس طرح کرتے ہیں۔ پس مسلمانوں کو آنحضرت کا اسوہ حسنہ اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔

ہر کہ عشقِ مصطفٰے سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

تربیتِ خودی کے تین مراحل ہیں۔ (۱)۔ دستورِ الٰہی کی اطاعت۔ (۲)۔ ضبط نفس (۳)۔ نیابتِ الٰہی۔

نیابتِ الٰہی، دنیا میں انسانی ارتقا کی آخری منزل ہے۔ جو شخص اس منزل پر پہنچ جاتا ہے وہ اس دنیا میں خلیفۃ اللہ ہوتا ہے۔ وہ کامل خودی کا مالک اور انسانیت کا منتہائے مقصود اور روح اور جسم دونوں کے لحاظ سے حیات کا بلند ترین مظہر ہوتا ہے۔ یعنی اس کی زندگی میں آکر حیات اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ کائنات کے پیچیدہ مسائل اس کی نظر میں سہل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ ترین قوت اور برترین علم دونوں کا حامل ہوتا ہے اس کی زندگی میں فکر اور

علم، جبلت اور ادراک سب ایک ہوجاتے ہیں۔

چونکہ وہ سب کے آخر میں ظاہر ہوگا اس لیے وہ تمام صعوبتیں جو انسانیت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں لاحق ہوتی ہیں بر محل ہیں۔ اس کے ظہور کی پہلی شرط یہ ہے کہ بنی نوع آدم جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے ترقی یافتہ ہوجائیں۔ فی الحال اس کا وجود خارج میں موجود نہیں۔ لیکن انسانیت کی تدریجی ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ زمانہ آئندہ میں افرادِ کاملہ کی ایسی نسل پیدا ہوجائے گی، جو حقیقی معنوں میں نیابتِ الٰہی کی اہل ہوگی۔

زمین پر خدا کی بادشاہت کے یہ معنی ہیں کہ یہاں یکتا افراد کی جماعت جمہوری رنگ میں قائم ہوجائے ان کا صدر اعلیٰ وہ شخص ہوگا جو ان سب پر فائق ہوگا اور اس کا نظیر دنیا میں نہ مل سکے گا۔

نیٹشے نے بھی اپنے تخیل میں افرادیکتا کی ایسی جماعت کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ لیکن اس کے نسلی تعصب نے اس تصویر کو بھونڈا کردیا۔

------(۲)------

'اسرارِ خودی'

کے مباحث عالیہ کا مختصر خاکہ

علامہ نے اپنے فلسفہ کی جو تشریح فرمائی ہے اس پر اضافہ کرنا میری لیاقت سے باہر ہے۔ لیکن میں ناظرین کی آگاہی کے لیے اسرار خودی کے مباحث کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوجائے۔
(۱)۔ شاعری علامہ کے لیے مقصود بالذات نہیں ہے۔ ذریعۂ اظہارِ خیالات ہے۔ لکھتے ہیں:

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست بت پرستی گری مقصود نیست
۱۲ ؎

پس جو لوگ اقبال کو محض شاعر تصوّر کرتے ہیں اور اس کے کلام کو عروضی قواعد پر پرکھتے ہیں، حقیقت سے نا آشنا ہیں۔ اقبال شاعر نہیں "پیغام گو" ہے۔
(۲)۔ خودی اصلِ نظام عالم ہے اور تسلسل حیات استحکام خودی پر منحصر ہے۔ کائنات کی ہر شے میں "خودی" موجود ہے۔
چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است پس بقدرِ استواری زندگی است
۱۳ ؎
قطرہ چوں حرفِ خودی از برکند ہستیٔ بے مایہ را گوہر کند
۱۴ ؎

(۳)۔ خودی کی حیات و بقاء تخلیق و تولید مقاصد پر منحصر ہے جس خودی (شخص) کے سامنے کوئی نصب العین نہیں وہ مردہ ہے اس کا عدم و وجود برابر ہے۔
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
۱۵ ؎
دل ز سوزِ آرزو گیرو حیات غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات
۱۶ ؎

زندہ را نفیٔ تمنا مردہ کرد شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد
۱۷ ؎

علم از سامانِ حفظ زندگی است علم از اسبابِ تقویمِ خودی است

۱۸ے

(۴)۔ خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔

از محبت می شود پاینده تر زنده تر سوزنده تر تابنده تر

۱۹ے

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست اصلِ عشق از آب و باده و خاک نیست

۲۰ے

خاک نجد از فیض او چالاک شد آمد اندر وجد و بر افلاک شد

۲۱ے

(۵)۔ عشق کا طریقہ محمد عربی سے سیکھنا چاہیے۔

در دل مسلم مقامِ مصطفٰے است آبروئے ما زنامِ مصطفٰے است

۲۲ے

آنکه بر اعداء درِ رحمت کشاد مکه را پیغامِ لاتثریبَ داد

۲۳ے

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت

۲۴ے

چوں گلِ صد برگ مارا بویکیست اوست جانِ ایں نظام و اویکیست

۲۵ے

(٦)۔ بغیر آپ کی اتباع کے خودی مرتبۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔

عاشقی محکم شو از تقلیدِ یار تا کمندِ تو کند یزداں شکار

۲۶ے

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا شرحِ انی جاعلٌ سازد ترا

۲۷ے

(۷)۔ خودی سوال سے یعنی دوسروں کی نقالی کرنے سے ضعیف ہوجاتی ہے اور ترقی نہیں کر سکتی۔

خود فرود آ از شتر مثلِ عمر رضی اللہ عنہ الحذر از منتِ غیر الحذر

۲۸ے

رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو موجِ آب از چشمۂ خاور مجو

۲۹ے

تا نباشی پیشِ پیغمبر خجل روز فردائے کہ باشد جاں گسل

۳۰ے

ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز آبروئے ملت بیضا مریز

۳۱ے

(۸)۔ جب خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوجاتی ہے تو نظام عالم کو مسخر کر لیتی ہے۔

پنجۂ او پنجۂ حق می شود ماہ از انگشتِ او شوق می شود

۳۲ے

در خصوماتِ جہاں گردد حکم تابعِ فرمانِ او دارا و جم

۳۳ے

(۹)۔ مسئلہ نفیٔ خودی اقوام مغلوبہ کی ایجاد ہے جس کی وجہ سے اقوام غالبہ کے قویٰ ضعیف ہوجاتے ہیں اس لیے اس مسئلہ سے احتراز کرنا لازم ہے۔ یہ مسئلہ ہلاکت کا پیش خیمہ ہے۔

صد مرض پیدا شد از بے ہمتی کوتہ دستی، بے دلی، دوں فطرتی

۳۴؎

(۱۰)۔ افلاطون کے خیالات سے احتراز کرنا واجب ہے کیونکہ اس نے ترکِ عمل کی تعلیم دی ہے اور یہ بات خودی کے لیے مضر ہے۔

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود جانِ او وارفتہ معدوم بود

۳۵؎

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت خالق اعیانِ نا مشہود گشت

۳۶؎

قومہا از سکر، او مسموم گشت خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

۳۷؎

---

(۱۱)۔ ادبیاتِ اسلامیہ بھی مثل دیگر شعبوں کے محتاج اصلاح ہیں۔ شعراء اور ادباء کو چاہیے کہ ایسے مضامین سپرد قلم کریں جن سے قوم کی مردہ رگوں میں حرکت پیدا ہو۔

اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن برعیارِ زندگی او را بزن

۳۸؎

فکرِ روشن بیں عمل را رہبر است چوں درخشِ برق پیش از تندر است

۳۹؎

فکرِ صالح در ادب می بایدت رجعتے سوئے عرب می بایدت

۴۰؎

(۱۲)۔ تربیتِ خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الہیہ۔

(ا)۔ اطاعت

در اطاعت کوش اے غفلت شعار می شود از جبر پیدا اختیار

۴۱ے

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی تو چرا غافل زایں ساماں رومی

۴۲ے

شکوہ سنج سختئ آئیں مشو از حدودِ مصطفٰے بیروں مرو

۴۳ے

(ب)۔ ضبط نفس

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں می شود فرماں پذیر از دیگراں

۴۴ے

تا عصائے لا الٰہ داری بدست ہر طلسم خوف را خواہی شکست

۴۵ے

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد فارغ از بندِ زن و اولاد شد

۴۶ے

می کند از ما سوی قطعِ نظر می نہد سا طور بر حلقِ پسر

۴۷ے

(ج)۔ نیابت الٰہی

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است ہستیٔ او ظل اسمِ اعظم است

۴۸؎

از رموز جزو و کل آگہ بود در جہاں قائم بامر اللہ بود

۴۹؎

نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر

۵۰؎

مدعائے علم الاسما ستے سرِّ سبحان الذی اسرا ستے

۵۱؎

ذاتِ او توجیہہ ذاتِ عالم است از جلالِ او نجاتِ عالم است

۵۲؎

---

(۱۳)۔ حیاتِ ملی کا تسلسل، روایاتِ ملیہ کی حفاظت و مداومت پر موقوف ہے۔ جو قوم اپنی ملی روایات سے بے خبر ہوجاتی ہے وہ صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ پس مسلمانوں کو اپنی ثقافتی روایات پر قائم رہنا چاہیے۔

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن پشتِ پا بر مسلکِ آبا مزن

۵۳؎

(۱۴)۔ مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور جہاد کا مقصود اگر تسخیر ممالک ہو تو وہ اسلام میں حرام ہے۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است مسلم ار عاشق نباشد کافر است
۵۴ے

تابعِ حق دیدنش نا دیدنش خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش
۵۵ے

قربِ حق از ہر عمل مقصود وارتا ز تو گردد جلالش آشکار
۵۶ے

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید تیغ او بر سینۂ او آرمید
۵۷ے

زندگی از طوفِ دیگر رستن است خویش را بیت الحرم دانستن است
۵۸ے

(۱۵)۔ موجودہ عقل و خرد اور تہذیب در اصل جہالت اور سفاہت ہے۔ مسلمانوں کو اس مادی تمدن اور مغربی تہذیب سے بچنا چاہیے کیونکہ اس کی بنیاد غیر اللہ پر قائم ہے اور اس لیے کمزور ہے۔
علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است معنیٔ اسلام ترکِ آفل است
۵۹ے

سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجوے
۶۰ے

دانشِ حاضر حجابِ اکبر است بت پرست و بت فروش و بتگر است
۶۱ے

(۱۶)۔ وقت (TIME) پر وہی شخص حکمران ہو سکتا ہے۔ جو اپنی خودی سے واقف ہو۔
چنانچہ مرشد رومی کہتے ہیں:

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را اوست سید جملہ موجودات را

۶۲ے

امام شافعی نے وقت کو سیفِ قاطع قرار دیا ہے۔ وقت در اصل حیات ہے اور کوئی

شخص حیات کو وقت سے جدا کر کے سمجھ بھی نہیں سکتا۔

من چہ گویم سر ایں شمشیر چیست آب او سرمایہ دار از زند گیست

۶۳ے

پنجۂ حیدر کہ خیبر گیر بود قوتِ او از ہمیں شمشیر بود

۶۴ے

تو کہ از اصل زماں آگہ نہ از حیاتِ جاوداں آگہ نہ

۶۵ے

زندگی از دہر و دہر از زندگی است لا تسبو الدہر، فرمانِ نبی است

۶۶ے

نغمۂ خاموش دارد ساز وقت غوطہ در دل زن کہ بینی راز وقت

۶۷ے

(۱۷)۔ آخر میں علامہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ:

(ا)۔ عشق را از شغلِ لَا آگاہ کن آشنائے رمز الّا اللہ کن

۶۸ے

(ب)۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سینہ دل سے خالی ہے۔ یعنی محمل تو ہے مگر لیلیٰ نہیں۔ میں مثل شمع کے تنہا جل رہا ہوں کوئی میرا دلسوز نہیں۔ پس اے خدایا تو یہ امانت مجھ سے واپس لے لے یا مجھے ایک ہم دم عطا کر۔

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے از رموزِ فطرتِ من محرمے

۶۹؎

تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش باز بینم در دلِ او روئے خویش

۷۰؎

ملت اسلامیہ کے نام اقبال کا پیغام

خلاصۂ رموزِ بے خودی

جس طرح خودی کے معنی تکبر یا غرور کے نہیں ہیں اسی طرح بے خودی کے معنی بے ہوشی یا خود فراموشی کے نہیں۔ بلکہ یہ فرد کی زندگی کی اس کیفیت کا نام ہے جو جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔

(۱)۔ ربطِ فرد و ملت

علامہ فرماتے ہیں کہ فرد تنہا زندگی بسر کرنے کے لیے نہیں پیدا ہوا۔ جہاں تک ہو سکے جماعت کے ساتھ رہنا چاہیے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "شیطان جماعت سے دور رہتا ہے"۔

فرد می گیرد ز ملت احترام ملت از افراد می یابد نظام

۷۱؎

فرد قوم سے جدا ہو کر اپنی ہستی کھو بیٹھتا ہے اور ترقی کی جملہ راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

ہر کہ آب از زمزمِ ملت نخورد شعلہ ہائے نغمہ در عودش فسرد

۷۲؎

انسان کے اندر "جوہر نوری" ہے۔ قوت ادراک اسی کی ایک شعاع ہے ۔ اس کی ترقی جماعت میں رہ کر ہی ہو سکتی ہے۔

فطرتش آزاد و ہم زنجیری است جزوِ او را قوتِ کل گیری است

۷۳ے

در جماعت خود شکن گردد خودی تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

۷۴ے

(۲)۔ ملت اختلاط افراد سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی تربیت کی تکمیل نبوت سے ہوتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انبیاء کو اس لیے بھیجتا ہے کہ وہ مختلف الخیال افراد کو ایک سلک میں منسلک کرکے قوم بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ نے ایک قوم بنا دیا اور عربوں کو سرکارِ مدینہ نے

محفلِ انجم ز جذبِ باہم است ہستیٔ کوکب ز کوکب محکم است

۷۵ے

نبی افراد کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

گویدش تو بندۂ دیگر نہ زیں بتانِ بے زبان کمتر نہ

۷۶ے

اس کے بعد انہیں ایک سلک میں منسلک کرتا ہے۔

تا سوئے یک مدعایش می کشید حلقۂ آئیں بپایش می کشد

۷۷ے

نکتۂ توحید باز آموزدش رسم و آئینِ نیاز آموزدش

۷۸ے

(۳)۔ ارکانِ اساسی (BASIC PRINCIPLES OF ISLAM)

(ا)۔ اسلام کا رکنِ اوّل توحید ہے۔ یہ اسلام کا امتیازی نشان ہے۔ اور اسلام کا سارا فلسفہ اسی توحید میں مضمر ہے۔ عقلِ انسانی اسی توحید کی بدولت منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ ورنہ اس بے چاری کو ساحل کہاں مل سکتا ہے؟ مومن میں دین، حکمت، آئین، زور، قوت اور تمکین سب توحید کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب مسلم حقیقی معنی میں خدائے واحد کا پرستار ہوجاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟

بیم و شک میرد، عمل گیرد حیات چشم می بیند ضمیرِ کائنات

۷۹؎

چوں مقام عبدۂ محکم شود کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود

۸۰؎

ملت اسلامیہ کے لیے توحید بمنزلہ روحِ رواں ہے۔ اگر توحید کا تصور خارج کر دیا جائے تو ملت اسلامیہ لاشہ بے جان رہ جائے گی۔

ملت بیضا تن و جاں لا الہ ساز ما را پردہ گرداں لا الہ

۸۱؎

لا الہ سرمایۂ اسرارِ ما رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما

۸۲؎

چونکہ اسلام کا خدا ایک ہے اس لیے ملت اسلامیہ کا مقصود بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔

ملت از یک رنگیٔ دلہا ستے روشن از یک جلوی ایں سینا ستے

۸۳؎

قوم را اندیشہ ہا باید یکے در ضمیرش مدعا باید یکے

۸۴؎

مسلمان کو حسب و نسب پر نازاں نہیں ہونا چاہیے۔ "ان اکرمکم عند اللہ اتقکم"

بر نسب نازاں شدن نادانی است حکمِ او اندر تن و تن فانی است

۸۵ے

ملت مارا اساسِ دیگر است ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است

۸۶ے

ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم

۸۷ے

(۳)۔ ب: یاس و حزن و خوف ام الخبائث ہیں اور حیات کے دشمن ہیں۔ توحید پر اگر کامل ایمان ہو تو ان امراض کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ کبھی نا امید نہ ہو۔ کیونکہ نا امیدی، حیات کے لیے سامانِ مرگ ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لا تقنطوا من رحمۃ اللہ"

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر از نبی تعلیمِ لاتحزن بگیر

۸۸ے

قوتِ ایماں حیات افزایدت وردِ لا خوف علیہم بایدت

۸۹ے

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است کاروانِ زندگی را رہزن است

۹۰ے

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست اصلِ او بیم است اگر بینی درست

۹۱ے

ہر کہ رمزِ مصطفٰے فہمیدہ است شرک را در خوف مضمر دیدہ است

۹۲ے

خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس خوفِ غیر از شرک پنہان است و بس

۹۳ے

(۴)۔ رکنِ دوم رسالت: جس چیز کی توحید کے بعد ضرورت ہے وہ ایمان بر رسالت ہے۔ رسالت پر ایمان لانے سے تنِ مردہ میں جان آجاتی ہے اور دین وآئین کی بنیاد رسالت ہی ہے۔ رسول، مسلم کے قلب و جگر کی قوت ہوتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ پیارا ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیں خدا تک پہنچاتا ہے۔ اس کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا مسلمان کے لیے موت کا حکم رکھتا ہے۔

سرکارِ مدینہ نے ہمیں دینِ حق اور مذہبِ فطرت عطا کیا اور اس لیے کہ ہماری وحدت میں کوئی تفرقہ پیدا نہ ہو اور ہماری ہستی ابدی ہوجائے۔ خدا نے ہمارے رسول پر رسالت ختم کردی۔

قوتِ قلب و جگر گردد نبی از خدا محبوب تر گردد نبی

۹۴ے

دینِ فطرت از نبی آموختیم در رہِ حق مشعلے افروختیم

۹۵ے

لانبی بعدی ز احسان خدا است پردۂ ناموسِ دین مصطفٰے است

۹۶ے

(۴)۔ ب: رسالتِ محمدی کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کے اندر حریت و اخوت و مساوات قائم ہوجائے۔ آنحضرت کی بعثت سے پہلے انسان انسان پرست تھا۔ آنحضرت نے دنیا کو حریت و اخوت و مساوات کا سبق پڑھایا۔

کل مومن اخوۃ اندر دلش حریت سرمایۂ آب و گلش

۹۷ے

نا شکیبِ امتیازات آمدہ در نہادِ او مساوات آمدہ

۹۸ے

اس کے بعد علامہ نے تاریخ اسلامی سے ان تینوں کی مثالیں دی ہیں۔ حریت کی مثال میں امام حسین کی شہادت پیش کی ہے۔

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است پس بنائے لا الہ گرویدہ است

۹۹؎

ما سو اللہ را مسلماں بندہ نیست پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

۱۰۰

رمزِ قرآن از حسین آموختیم ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم

۱۰۱؎

رمزِ قرآن سے علامہ کی مراد یہ ہے کہ مسلمان کو ہر حال میں باطل کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو جان دینے سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔

(۵)۔ چونکہ ملت محمدی کی بنیاد توحید اور رسالت پر ہے اور یہ حقائق محدود فی المکان نہیں ہیں اس لیے ملت محمدی بھی محدود فی المکان نہیں۔ اس لیے:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

مسلم استی دل باقلیمے بند گم مشو اندر جہانِ چون و چند

۱۰۲؎

دل بدست آور کہ در پہنائے دل می شود گم ایں سرائے آب و گل

۱۰۳؎

آنحضرت نے اپنے وطن سے ہجرت کرکے مسلم کی قومیت کا عقدہ حل کردیا۔ مدینہ کو وطن بنالیا جو آپ کا جائے ولادت نہیں تھا۔ یعنی تمام دنیا مسلمان کا وطن ہے اور تمام زمین

اس کے لیے مسجد ہے۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

۱۰۴ ؎

صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

۱۰۵ ؎

ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد چوں فلک در شش جہت آباد شد

۱۰۶ ؎

(٦)۔ وطن اساسِ ملت نہیں ہے۔ وطنیت کے عقیدہ کو علامہ مسلمان قوم کے لیے از بس مضر خیال کرتے ہیں کیونکہ اس کی بنا پر اخوت کا زریں اصول تباہ ہوجاتا ہے۔ جو لوگ ملت کی تعمیر وطنیت کے اصولوں پر کرتے ہیں وہ نوع انسان کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں۔ دنیا میں جو کچھ ہنگامہ بپا ہے اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی نظر آتی ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔ اساسِ ملت وطن نہیں بلکہ مذہب ہے۔

تا سیاست مسندِ مذہب گرفت ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت

۱۰۷ ؎

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند آدمیت گم شد و اقوام ماند

۱۰۸ ؎

(۷)۔ جس طرح ملت محمدی محدود فی المکان نہیں اسی طرح مقید بالزمان بھی نہیں۔ اگرچہ فرد و ملت کی اجل مقرر ہے اور ملت بھی فرد کی طرح مردہ ہوجاتی ہے۔ لیکن ملت محمدی اجل سے محفوظ ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس ملت کی بقا کا خود وعدہ فرمایا ہے۔

امتِ مسلم ز آیاتِ خدا ست اصلش از ہنگامہ قالوا بلی ست

۱۰۹ ؎

از اجل ایں قوم بے پرواستے استوار از نحن نزلنا ستے

۱۱۰ے

تا خدا ان یطفئوا فرمودہ است از فسردن ایں چراغ آسودہ است

۱۱۱ے

(۸)۔ نظامِ ملت کسی ضابطہ کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا اور اس لیے خدا نے نظامِ ملت کے قیام و ثبات کے لیے قرآن پاک نازل فرمایا ہے۔ پس اگر مسلمان اپنا ملی نظام استوار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں قرآن کو اپنا دستور حیات اور ضابطہ عمل بنانا چاہیے۔

ہستی مسلم ز آئین است و بس باطنِ دینِ نبی این است و بس

۱۱۲ے

آں کتابِ زندہ، قرآن حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم

۱۱۳ے

حرفِ او را ریب نے، تبدیل نے آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

۱۱۴ے

نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ او رحمۃ للعالمین

۱۱۵ے

اس کے بعد علامہ نے مسلمِ سست پیما سے خطاب کیا ہے اور دو لفظوں میں رازِ حیات بیان کردیا ہے۔

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو شیوہ ہائے کافری زندان توٍ

۱۱۶ے

قطع کردی امرِ خود را در زبر جادہ پیمائی الی شیءً نکر

۱۱۷ے

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن

۱۱۸ے

(۹)۔ انحطاط کے زمانہ میں تقلید کرنا اجتہاد کرنے سے زیادہ مفید ہے۔ یہاں تقلید کے معنی فقہی نہیں ہیں بلکہ روایاتِ ملی پر عامل ہونے کے ہیں۔ علامہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

اگر تقلید بودے شیوۂ نیک پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

۱۱۹ے

یعنی تقلید کو برا بتایا ہے۔ اس جگہ تقلید کو اجتہاد سے اولیٰ تر قرار دیا ہے پس معلوم ہوا کہ وہاں تقلید کے معنی کورانہ پیروی کے ہیں اور یہاں تقلید کے معنی اپنی ثقافتی روایاتِ (CULTURAL TRADITIONS) ملی کی حفاظت اور ان پر عمل کرنا ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است

۱۲۰ے

اس شعر میں خود بھی تقلید کے معنی صاف کردیے ہیں۔

نقش بر دل معنیٔ توحید کن چارۂ کارِ خود از تقلید کن

۱۲۱ے

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط قوم را برہم ہمی پیچد بساط

۱۲۲ے

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

۱۲۳ے

از یک آئینہ مسلماں زندہ است پیکرِ ملت ز قرآن زندہ است

۱۲۴ے

ما ہمہ خاک و دل آگاہ اوست اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست

۱۲۵ے

الغرض تقلید کے معنی ہیں قرآنی احکام کی بے چون و چرا تعمیل کرنا اور یک آئینہ کو اپنا نصب العین بنانا، سنت نبوی پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنا اور ہر معاملہ میں قرآن سے فیصلہ طلب کرنا۔

(۱۰)۔ اتباع آئینِ الہیہ سے سیرت ملی میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عنوان حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن وہ ہیرا ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے تراشا ہے۔ اس میں سراسر نور اور روشنی ہے اس کا ظاہر بھی موتی ہے اور باطن بھی موتی ہے۔ اس کا ظاہر و باطن دونوں ایک ہے۔ علمِ حقیقت شریعت سے جدا نہیں ہے اور سنت کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے محبت کی جائے۔ ہر کہ عشق مصطفٰے الخ، اگر مسلمان اپنے ایمان کو مضبوط اور شاداب رکھنا چاہتے ہیں تو اتباعِ شریعت کریں۔ ملت کا نظام اتباعِ شریعت پر مبنی ہے۔ جب یہ نظام محکم ہوجاتا ہے تو ملت کو دوام نصیب ہوجاتا ہے۔ لوگ اسلام کا "راز" (SECRET) پوچھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت ہی اسلام کا راز ہے۔

اگر کوئی قوت اتباع شریعت میں مزاحم ہو تو اس کا مقابلہ کرنا فرض ہے۔

سر ایں فرمانِ حق دانی کہ چیست زیستن اندر خطرہا زند گیست

۱۲۶ے

آنحضرت ﷺ کا دین زندگی بخشنے والا دین ہے۔

ہست دینِ مصطفٰے دینِ حیات شرعِ او تفسیر آئینِ حیات

۱۲۷ے

جب سے مسلمانوں نے شعارِ نبوی سے روگردانی کی، رمزِ بقا سے محروم ہوگئے۔

تا شعارِ مصطفٰے از دست رفت قوم را رمزِ بقا از دست رفت

۱۲۸ے

آخر میں نصیحت کی ہے کہ عجمی خیالات سے پرہیز کرو کیونکہ وہ حدودِ اسلام سے تجاوز کرنا سکھاتے ہیں۔ عرب سے الفت پیدا کرنا چاہیے۔

با مریدے گفت اے جانِ پدر از خیالات عجم باید حذر

۱۲۹ ؎

زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گزشت از حدِ دینِ نبی بیروں گزشت

۱۳۰ ؎

قلب را زیں حرفِ حق گرداں قوی با عرب در سازتا مسلم شوی

۱۳۱ ؎

---

(۱۱)۔ سیرت قومی میں اتباع رسول سے حسن و خوبی پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مرشد رومی رحمہ اللہ تعالی نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

مگسل از ختم الرسل ایّام خویش تکیہ کم کن برفن و برگامِ خویش

۱۳۲ ؎

مسلمانوں کے لیے حضرت ختمی مرتبت کی ذات ستودہ صفات بہترین نمونہ ہے۔ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو رہنما بنا ناکار نادانی ہے۔

غنچۂ از شاخسارِ مصطفٰے گل شو از بادِ بہارِ مصطفٰے

۱۳۳ ؎

از بہارش رنگ و بو باید گرفت بہرۂ از خلق او باید گرفت

۱۳۴ ؎

آنکہ مہتاب از سرانگشتش دو نیم رحمتِ او عام و اخلاقش عظیم

۱۳۵ ؎

از مقامِ او اگر دور ایستی از میانِ معشرِ ما نیستی

۱۳۶ ؎

(۱۲)۔ حیات ملیہ کے لیے ایک مرکزِ محسوس بھی اشد ضروری ہے اور مسلمانوں کا مرکز بیت اللہ ہے۔ سب مسلمانوں کو اس سرزمین کو اپنا مرکز یقین کرنا چاہیے۔ مکہ واقعی ہمارا کعبۂ مقصود ہے اور جسے مکہ سے محبت نہیں اس

کے ایمان میں خلل ہے جو جماعت مکہ کو چھوڑ کر کسی اور سرزمین کو اپنا مرکز قرار دے وہ اسلام سے خارج ہے۔

ہم چناں آئینِ میلادِ امم زندگی بر مرکزے آید بہم

۱۳۷؎

قوم را ربط و نظام از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے

۱۳۸؎

راز دار و رازِ مابیت الحرام سوِ ما ہم سازِ مابیت الحرام

۱۳۹؎

در جہاں مارا بلند آوازہ کرد با حدوثِ ما قدم شیرازہ کرد

۱۴۰؎

(۱۳)۔ تنظیم حقیقی کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ افرادِ ملت کے سامنے کوئی نصب العین ہو اور ہر فرد اس کے حصول میں منہمک ہو اور امت محمدی کا نصب العین یہ ہے کہ توحید کی حفاظت اور اشاعت کی جائے گویا ہر مسلمان مبلغ اسلام ہے۔

مدعا رازِ بقائے زندگی جمعِ سیمابِ قوائے زندگی

۱۴۱؎

چوں حیات از مقصدے محرم شود ضابطِ اسبابِ ایں عالم شود

۱۴۲؎

ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل کیف و کم ازوے پذیرد ہر عمل

۱۴۳؎

زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست

۱۴۴؎

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے گر مسلمانی نیا سائی دمے

۱۴۵؎

آجکل جبکہ الحاد اور مادیت کا زور ہے قرآنی تعلیمات کی اشاعت از بس ضروری ہے۔ موجودہ مشکلات کا حل اس کتاب میں موجود ہے۔ پس مسلمانوں کو یکسر تبلیغ و اشاعتِ اسلام میں منہمک ہوجانا چاہیے۔

(۱۴)۔ حیاتِ ملی میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے وسعت پیدا ہوسکتی ہے۔ عہدِ ماضی میں مسلمانوں کا یہی شعار تھا۔ لیکن اب علوم و فنون سے بے بہرہ ہیں۔ تحقیق و اجتہاد کو کفر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی درکنار تنزل کر رہے ہیں۔

ما سوا از بہرِ تسخیر است و بس سینۂ او عرضۂ تیر است و بس

۱۴۶؎

غنچہ ناز خود چمن تعبیر کن شبنمی خورشید را تسخیر کن

۱۴۷؎

خیز و واکن دیدۂ مخمور را دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را

۱۴۸؎

غایتش توسیع ذاتِ مسلم است امتحانِ ممکناتِ مسلم است

۱۴۹؎

حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد

۱۵۰؎

تو کہ مقصودِ خطابِ اُنظری پس چرا ایں راہ چوں کوراں بری

۱۵۱؎

علمِ اسما اعتبارِ آدم است حکمتِ اشیاء حصارِ آدم است

۱۵۲؎

(۱۵)۔ حیاتِ ملیہ کا کمال یہ ہے کہ ملت میں بھی فرد کی طرح اپنی خودی کا احساس پیدا ہوجائے اور اس احساس کی تولید اور تکمیل اپنی ملی روایات (CULTURAL TRADITIONS) کی حفاظت اور اشاعت سے ممکن ہے۔
ملت میں خودی کے احساس کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد اپنی جگہ بہبودِ ملت کا ذمہ دار ہو۔

اگر زید کو تکلیف پہنچے تو تمام جماعت اس تکلیف کو محسوس کرے۔ اس کا نظارہ دہلی نے ۱۸۵۷ء میں دیکھا تھا جبکہ بارہ سپاہیوں اور ان کے افسر نے بخوشی میگزین میں آگ لگا دی اور خود بھی اس میں جل کر مر گئے تاکہ وہ بارود ان کے دشمن ان کے بھائیوں کے خلاف استعمال نہ کرسکیں۔ وہ بظاہر مر گئے لیکن بباطن زندہ ہیں اور لارڈ و لنگڈن سر بربرٹ ایمرسن اور دوسرے گورنر ان صوبجات کی شکل میں آج ۱۹۳۳ میں ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں یہ احساس پیدا نہ ہو ان کا ابھرنا اور ترقی کرنا معلوم۔ فی الحال تو یہ کیفیت ہے کہ ہندو سے

زیادہ مسلمان، مسلمان کا دشمن ہے۔ میونسپل کمیٹی اور کونسل سب جگہ منافرت اور منافقت کا بازار گرم ہے۔ (واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۳۳ء کی ہے: مدیر)

اس احساس کو پیدا کرنے کے لیے تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنا اور اپنی روایات ملی کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ زندہ اقوام اپنی روایات کی بہت حفاظت کرتی ہیں اور بچوں کے قلوب میں ان روایات کا نقش قائم کرتی ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ہماری تعلیم انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور انہیں کلرکوں کی ضرورت ہے نہ کہ قومی درد رکھنے والوں کی۔

طفل میں بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ ہے ڈبے کا اور تعلیم ہے سرکار کی

ربطِ ایام است ما را پیرہن سوزنش حفظِ روایاتِ کہن

۱۵۳ے

چیست تاریخ اے زخود بیگانۂ داستانے قصۂ افسانہ

۱۵۴ے

ایں ترا از خویشتن آگہ کند آشنائے کار و مردِ رہ کند

۱۵۵ے

مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

۱۵۶ے

(۱۶)۔ بقائے نوع امومت (MOTHERHOOD) پر منحصر ہے اس لیے اسلام میں امومت کے احترام کو فرض عین قرار دیا ہے۔

اسلام نے "عورت" کو بڑا بلند درجہ عنایت کیا ہے کیونکہ عورت مرد کے لیے باعثِ

تسکین اور کائنات کے لیے موجبِ رونق ہے۔ مرد میں عورت ہی کی وجہ سے نغمہ پیدا ہوتا ہے بلکہ مرد کے لیے موجبِ زینت و آسائش ہے اسی لیے آنحضرت ﷺ نے خوشبو اور نماز کے ساتھ اس کا ذکر بھی فرمایا۔

جو مسلمان عورت کو اپنا خادم یا ماتحت خیال کرتا ہے وہ فہمِ قرآن سے محروم ہے۔ لکھتے ہیں:

آنکہ نازد بر وجودش کائنات ذکرِ او فرمود با طیب و صلوۃ

۱۵۷ے

مسلمے کو را پرستارے شمرد بہرۂ از حکمتِ قرآن نبرد

۱۵۸ے
نیک اگر بینی امومت رحمت است زانکہ او را با نبوت نسبت است
۱۵۹ے
شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است سیرتِ اقوام را صورت گر است
۱۶۰ے
گفت آں مقصودِ حرفِ کن فکاں زیرِ پائے امہات آمد جناں
۱۶۱ے
ملت از تکریم ارحام است و بس ورنہ کارِ زندگی خام است و بس
۱۶۲ے

حافظِ رمزِ اخوت مادراں قوتِ قرآن و ملت مادراں
۱۶۳ے

(۱۷)۔ عورتوں کے لیے سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء اسوۂ حسنہ ہیں۔
مزرعِ تسلیم را حاصل بتول مادراں را اسوۂ کامل بتول
۱۶۴ے
آں ادب پروردۂ صبر و رضا اسیا گردان و لب قرآن سرا
۱۶۵ے

(۱۸)۔ خطاب بہ محذراتِ اسلام۔ علامہ مسلمان عورتوں سے خطاب فرماتے ہیں کہ مادران اسلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو سب سے پہلے اسلام اور اسلامی روایات سے آگاہ کریں اور اپنے فرض کو پہچانیں۔ وہ ذمہ دار ہیں اور بچوں کی سیرت انہی کے سانچہ میں ڈھلتی ہے۔
موجودہ زمانہ بڑا پر آشوب ہے، کفر و الحاد کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ ماؤں کو چاہیے کہ مسلمان بچوں کو قرآنی تعلیمات سے مسلح کرکے کارزارِ عالم میں بھیجیں۔
کودکِ ماچوں لب از شیرِ تو شست لا الہ آموختی او را نخست
۱۶۶ے

می ترا شد مہرِ تو اطوارِ ما فکرِ ما، گفتارِ ما، کردارِ ما

۱۶۷ے

دورِ حاضر ترفروش و پرفن است کاروانش نقدِ دیں را رہزن است

۱۶۸ے

کورویزداں ناشناس ادراکِ او ناکساں زنجیریٔ پیچاک او

۱۶۹ے

ہوشیار از دستبردِ روزگار گیر فرزندانِ خود را درکنار

۱۷۰ے

(۱۹)۔ آخر میں علامہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اپنے مخصوص رنگ میں لکھی ہے۔ میں اس کا خلاصہ بھی طوطیائے چشم بناتا ہوں۔

علامہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا تو ان سے کہا کہ امت مرحومہ کی بہبود کی کوئی صورت بتائیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ مسلمانوں کو سورۂ اخلاص سے آب و تاب حاصل کرنی چاہیے۔

توحید کا رنگ پیدا کرلو سارے عقدے حل ہوجائیں گے۔

بایکی ساز، از دوئی بردار رخت وحدتِ خود را مگرداں لخت لخت

۱۷۱ے

خدا نے مسلمانوں کو ایک قوم بنایا وہ اب ترک، افغان اور ہندی بنے ہوئے ہیں۔ قل ھو اللہ احد، کے معنی زبان سے ادا کرنے سے کام نہیں بنتا، جب تک مسلمان وحدت کا رنگ اپنے اندر نہ پیدا کریں۔ جس طرح ان کا خدا ایک ہے اسی طرح انہیں بھی ایک ہونا چاہیے۔

یک شوو توحید را مشہود کن غائبش را از عمل موجود کن

۱۷۲ے

لذتِ ایماں فزاید در عمل مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

۱۷۳ے

(ب)۔ اللہ الصمد کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ صمد ہے تم بھی غیر اللہ سے بے نیاز ہوجاؤ۔ اور صرف اللہ تعالیٰ کو کعبۂ مقصود بنا لو۔

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست زندگانی گردشِ دولاب نیست

۱۷۴ ؎

مسلم استی بے نیاز از غیر شو اہل عالم را سراپا خیر شو

۱۷۵ ؎

راہ دشوار است ساماں کم بگیر در جہاں آزاد زی آزاد میر

۱۷۶ ؎

پشتِ پا زن تختِ کیکاؤس را سربدہ از کف مدہ ناموس را

۱۷۷ ؎

بے نیازی رنگِ حق پوشیدن است رنگِ غیر از پیرہن شوئیدن است

۱۷۸ ؎

آفتاب استی یکے در خود نگر از بخورم دیگراں تا بے مخر

۱۷۹ ؎

تا کجا طوفِ چراغ محفلے ز آتشِ خود سوز اگر داری ولے

۱۸۰ ؎

(ج)۔ جس طرح اللہ تعالیٰ "لم یلد و لم یولد" ہے اسی طرح مسلم رنگ و خون سے بالا تر ہے۔ اسلام میں حسب و نسب، رنگ، قوم، ذات پات، نسل، زبان، دولت ثروت یہ سب ہیچ ہیں۔

فارغ از ام و اب و اعمام باش ہمچو سلماں زادۂ اسلام باش

۱۸۱ ؎

گر نسب را جزوِ ملت کردۂ رخنہ درکارِ اخوت کردۂ

۱۸۲ ؎

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم

۱۸۳ ؎

رشتۂ مایک تولایش بس است چشم مارا کیفِ صہبایش بس است

۱۸۴ ؎

عشق در جان و نسب در پیکر است رشتۂ عشق از نسبِ محکم تر است

۱۸۵ے

ہر کہ پادربندِ اقلیم وجد است بے خبر از لم یلد لم یولد است

۱۸۶ے

(د)۔ "ولم یکن لہ کفوا احد" کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح کوئی اللہ کا ہمسر نہیں، کوئی قوم مسلمانوں کی بھی ہمسر نہیں۔

رشتۂ با لم یکن باید قوی تا تو در اقوامِ بے ہمتا شوی

۱۸۷ے

آنکہ ذاتش واحد است و لا شریک بندہ اش ہم در نسازد با شریک

۱۸۸ے

خرقۂ لا تحزنوا اندر برش انتم الاعلون تاجے بر سرش

۱۸۹ے

پیش باطل تیغ و پیش حق سپر امر و نہی او عیارِ خیر و شر

۱۹۰ے

خوار از مہجوئ قرآن شدی شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

۱۹۱ے

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ در بغل داری کتابِ زندۂ

۱۹۲ے

---

(۲۰)۔ عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین

اس آخری باب میں علامہ نے سرکارِ مدینہ سے عرض کی ہے کہ حضور ﷺ ! مسلمان سرِ نبی سے بیگانہ ہوگیا ہے اس نے عرب سے اپنا رشتہ منقطع کرلیا ہے اور عجمی خیالات عجمی تمدن اور عجمی وضع اختیار کرلی ہے۔ میں نے اسے قرآن کی طرف بلایا ہے۔

محفل از شمعِ نوا افروختم قوم را رمزِ حیات آموختم

۱۹۳ے

لیکن اگر میں نے قرآن کے علاوہ کسی اور شے کی طرف بلایا ہے تو بے شک آپ مجھے جو مرضی ہو سزا دیں۔

کُردلم آئینہ بے جوہر است در بحر فم غیر قرآں مضمر است

۱۹۴ے

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

۱۹۵ے

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا بے نسیب از بوسۂ پا کن مرا

۱۹۶ے

اور اگر میں نے قرآن ہی کی طرف بلایا ہے تو پھر اتنی درخواست ہے۔

عرض کن پیشِ خدائے عز و جل عشق من گردد ہم آغوشِ عمل

۱۹۷ے

سب سے آخر میں علامہ نے سرکارِ مدینہ کے سامنے بڑے ادب کے ساتھ اپنی ایک دلی آرزو پیش کی ہے:

زندگی را از عمل ساماں نبود پس مرا ایں آرزو شایاں نبود

۱۹۸ے

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز آرزو دارم کہ میرم در حجاز

۱۹۹ے

از درت خیزد اگر اجزائے من وائے امروزم خوشا فردائے من

۲۰۰ے

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش مردے در سایۂ دیوار بخش

۲۰۱ے

علامہ کی یہ دعا اس قدر رقت آمیز ہے کہ کوئی صاحب دل بغیر چشم تر کیے اسے ختم نہیں کر سکتا۔

خدا کرے علامہ کی یہ دعا قبول ہو اور علامہ کے علاوہ دیگر عاشقانِ رسول کو بھی یہ سعادت نصیب ۔ آمین۔

(میثاق، جولائی و اگست ۱۹۲۹)

حواشی

۱؎ فقیر راقم الحروف نے دورانِ قیام سیالکوٹ میں علامہ موصوف کے والد بزرگوار شیخ نور محمد صاحب سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا۔ تقریب بہر ملاقات یوں ہوئی کہ میں نے ایک دن اپنے مکرم و محترم مولوی احمد دین صاحب مرحوم (والد بزرگوار حضرت اثر صہبائی مرحوم) عرض کی کہ میں والد علامہ اقبال، مولانا میر حسن اور علامہ عبدالحکیم مرحوم سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ فرمانے لگے میرے ساتھ چلو ان سب سے ملا دوں گا۔ چنانچہ ان کی معیت میں علامہ موصوف کے والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتوار کے دن، کوئی گیارہ کا عمل ہوگا، ہم دونوں پیدل روانہ ہوکر اس بزرگ کی خدمت میں جا پہنچے۔ شیخ صاحب موصوف کی عمر دسمبر ۱۹۲۸ء میں اسی اور نوے کے درمیان ہوگی۔ ۸۵ سے بہرحال کم نہ تھی۔ بصارت اور سماعت دونوں میں فرق آگیا تھا۔ مولوی صاحب نے مجھے متعارف کیا۔ میں نے کہا "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آج میں نے اس شخص کو دیکھا، جس کے گھر اقبال جیسا بلند اقبال پیدا ہوا۔ جس نے ارسطو افلاطون کی صف میں اپنے لیے جگہ بنائی ہے جو فلسفۂ مغرب کا ماہر ہونے کے باوجود نبی امی کا شیدائی ہے کہ جس کے زورِ کلام اور رفعتِ تخیل نے مشرق اور مغرب دونوں سے خراج تحسین وصول کیا ہے"۔ فرمانے لگے "یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ ذلک فضل اللہ الخ، پھر مجھے حقہ دیا میں نے ان کی خاطر سے دو چار کش لگائے۔ مولوی صاحب سے معلوم ہوا کہ شیخ صاحب نہایت ذہین اور طباع انسان تھے۔ جوانی میں ان کی دکان سیالکوٹ کے شرفا اور زندہ دل لوگوں کا مرکز تھی۔ وہ سرسید رحمہ اللہ تعالی کے بڑے حامی تھے اور اگرچہ تعلیم برائے نام تھی لیکن علمی اور مذہبی مسائل پر گفتگو کرتے تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی عامی یا کم سواد انسان ہے۔ صورت ڈاکٹر اقبال سے بہت ملتی تھی۔ رنگ جوانی میں شہاب ہوگا اس عمر میں بھی رخساروں پر سرخی باقی تھی۔ معلوماتِ عامہ کا چسکا پڑا ہوا کب چھوٹتا ہے۔ دوسروں سے اخبار پڑھوا کر سنتے تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

۲؎ میں نے مولانا کو دسمبر ۱۹۲۸ء میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس وقت ان کی عمر غالباً نوّے سال کی ہوگی۔ بصارت سے محروم ہو چکے تھے لیکن بصیرت کافی حاصل تھی۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی جوانوں کو درس عبرت دیتی تھی۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ بلا مبالغہ ہزاروں اشعار اردو، فارسی اور عربی کے نوکِ زبان تھے۔ میں نے نظیری کا ایک شعر پڑھا اور اس کے معانی دریافت کیے۔ فرمایا آپ تو ماشاء اللہ فارسی میں خاصی لیاقت رکھتے ہیں۔ اس شعر میں تو کوئی خاص بات نہیں۔ میں نے عرض کی کہ مقصود یہ ہے کہ شاگردی کا شرف

حاصل ہوجائے۔ آپ اقبال کے استاد ہیں جس کی شاگردی کے لائق بھی میں نہیں ہوں پس اگر آپ سے یہ نسبت حاصل ہوجائے تو فخرو مباہات کا ایک پہلو بیٹھے بٹھائے ہاتھ لگ جائے گا اور میں ہم چشموں میں یہ کہہ سکوں گا۔

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتاب تا با نیم

میری گفتگو سے قدرے محظوظ ہوئے اور فرمانے لگے "میاں ہمیں بھی استادوں کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کا چسکا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں یہی شوق کشاں کشاں غالب کی خدمت میں دلی لے گیا تھا۔ اس وقت سیالکوٹ میں ریل نہیں آئی تھی اس لیے وطن سے انبالہ تک گھوڑے پر سفر کیا تھا بعض موقعوں پر پیدل بھی چلنا پڑا۔ مگر شوق نے ساری منزلیں طے کرا دیں۔

مولانا کی دینداری اور علمیت کا حال بیان کرچکا۔ ایک واقعہ اور بیان کرتا ہوں۔ جوانی میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا جب تک پیدل چلنے کی طاقت باقی رہی روزانہ بلا ناغہ اپنی والدہ کی قبر پر جاتے رہے۔ ایک سپیارہ جاتے اور ایک آتے ختم کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ۵۶ سال تک جاری رہا۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

۳۔ ڈاکٹر سر ٹی ڈبلیو، آرنلڈ، سی آئی ، ای ڈی لٹ، ایم اے ، ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوکر آتے تھے۔ عجیب علم دوست اور ذہین و فطین اور بالغ نظر انسان تھا ۔ عربی اور اسلامیات سے بہت دلچسپی تھی اور راسخ العقیدہ ہونے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں سے نفرت نہیں تھی۔ تعصب نام کو نہ تھا۔ دعوتِ اسلام جس کا ترجمہ سرسید کے ایما سے شیخ عنایت اللہ خلف شمس العلماء بہادر منشی ذکاء اللہ دہلوی نے کیا تھا ایسی کتاب ہے جو در اصل ہمارے علماء کو لکھنی چاہیے تھی لیکن بقول علامہ شبلی ہمارے علماء اس سے کہیں زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہیں۔ مثلاً تکفیر اہل قبلہ، مسئلہ امتناعِ نظیر، مسئلہ امکانِ کذب، استنجا بالمدر اور بالماء ، حلتِ غراب، فاتحہ خلف الامام، امین بالجہر، رفعِ یدین، قیام در میلاد، صلوہ قبل المنبر، جواز شیئًا للہ، انہدامِ قباب، تقبیل الابہامین، استمداد عن القبور، احضار صورتِ محمدی، ایصال ثوب وغیرہ۔

اس کتاب سے ان کے تبحر علمی ، وسعت معلومات اور اعلی قابلیت کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

غالباً ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے لاہور آئے۔ یہاں انہوں نے تفسیرِ کبیر کے اقتباسات سے معتزلہ کے عقائد پر ایک رسالہ عربی زبان میں تالیف کیا تھا۔ جو لیوزک نے لندن سے ۱۹۰۳ء میں شائع کیا تھا۔ میں نے یہ رسالہ ۱۹۲۵ میں پڑھا تھا۔ چونکہ علم دوست تھے اس لیے انہیں علامہ اقبال

سے خاص انسیت ہوگئی تھی اور علامہ کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک نظم بھی ان کی یاد میں لکھی ہے جس کا عنوان ہے۔ "نالۂ فراق"

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں آہ مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں

پوری نظم بانگ درا صفحہ ۷۴ پر ملاحظہ فرمائیے۔

ان کی آخری تصنیف ISLAMIC FAITH ہے جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی اس کتابچے میں انہوں نے اپنے شاگرد (اقبال) کی خدمت میں بھی خراج تحسین ادا کیا ہے۔

۴۔ راستہ میں دہلی میں قیام کیا اور حضرت محبوب الٰہی رحمہ اللہ تعالی کے مزار پر کمال حسن عقیدت کے ساتھ حاضر ہوئے اور کامیابی کے لیے دعا کی۔ یہ دعا ایک نظم کی صورت میں آج بھی باصرہ نوازی اور بصیرت افروزی کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے اور بانگِ درا کے صفحہ ۹۷ پر مندرج ہے۔ پہلے بند میں توصیف ہے اس کے بعد التجا ہے:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانہ سے شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
پھر آرکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں کیا جنہوں نے محبت کا رازداں مجھ کو

فی الجملہ تمام نظم جذبات عالیہ سے معمور ہے۔ ناظرین کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔ اس نظم میں یہ شعر بھی تھا

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا ملا ہے جن کے کرم سے یہ آستاں مجھ کو

مگر مطبوعہ نظم میں یہ شعر درج نہیں ہے۔

۵۔ DR. MCTAGGART ۱۸۶۵ء/۱۹۲۳ء کیمبرج میں فلسفہ کا پروفیسر تھا اس کے فلسفیانہ نظام کا اصطلاحی نام ONTOLOGICAL IDEALISM ہے۔ اس کی فکر کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ چونکہ خودی (EGO) قائم بالذات اور ازلی ہے اس لیے خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جین دھرم کا بنیادی عقیدہ یہی ہے۔

۶۔ DR. E-BROWN تاریخ ادبیات ایران چہار جلد کے شہرۂ آفاق مؤلف فارسی اور عربی کے بے نظیر محقق، نہایت شریف اور نیک نفس انسان، جس نے صدہا نوجوانوں کو سکالر اور ڈاکٹر اور نقاد بنا دیا کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ کثیر نادر الوجود فارسی مخطوطات ان کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ بابی اور بہائی مذہب کے متعلق ان کی معلومات لائقِ رشک تھیں۔

۷۔ DR. R.A. NICHOLSON کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ بقیدِ حیات ہیں۔ مؤلف

تاریخ ادبیاتِ عرب۔ شعبۂ تصوف سے خاص دلچسپی ہے۔ کئی کتابیں اس موضوع پر تالیف کی ہیں۔ زاویۂ نگاہ تنگ اور غیر ہمدردانہ ہے۔ اسرارِ خودی کا ترجمہ 'SECRETS OF THE SELF' کے نام سے شائع

کرکے مسلمانوں پر احسانِ عظیم کیا ہے۔

۸؎ DR. SORLEY کیمبرج یونیورسٹی میں فلسفۂ اخلاق کے پروفیسر ہیں۔ عمر غالباً ۶۷ء سال ہوگی۔ ان کی مشہور تصنیف MORAL VALUES AND THE IDEA OF GOD ہے۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے ڈاکٹر اقبال کو کیمبرج مدعو کیا تھا۔

۹؎ ۳۵ء میں میوروڈ والی کوٹھی میں منتقل ہوگئے تھے۔

۱۹۲۶ء میں آپ اپنے عقیدت مندوں کے اصرار سے پنجاب کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے آمادہ ہوئے عموماً امیدوار ہزارہا روپیہ خرچ کرتے ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ ووٹر کی خوشامد وظیفۂ حیات بن جاتی ہے۔ لیکن اہلِ لاہور جانتے ہیں کہ اقبال بغیر "منت مخلوق" کامیاب ہوا تھا۔

کونسل میں آپ نے برابر تین سال تک ملک اور قوم کی گراں بہا خدمات انجام دیں جن کی تفصیل کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔

دسمبر ۲۸ء میں آپ کو انجمن اسلامیہ مدراس نے اسلام پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔ چنانچہ آپ نے چھ لیکچر دیے جو ۳۰ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوئے۔ وہاں سے آپ میسور بنگلور ہوتے ہوئے حیدر آباد کن آئے۔ یہاں کی علمی مجلسوں کو نوازا۔ اور طالباتِ علم کی پیاس بجھائی۔

دسمبر ۳۰ء سرکار برطانیہ نے گول میز کانفرنس میں نمائندہ مقرر کرکے لندن بھیجا۔ (۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو محمد علی کا انتقال ہوا)

اکتوبر ۳۲ء میں تیسری کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے۔

ماہ دسمبر ۳۲ء میں لندن میں ARISTOTELIAN SOCIETY کے سالانہ جلسہ میں ایک معرکۃ الآراء مضمون پڑھا جس کا عنوان ہے "IS RELIGION POSSIBLE"

اس سفر میں آپ نے اسپین کا بھی دورہ کیا اور عربوں کی عظمت رفتہ کے آثار غرناطہ اور قرطبہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ فروری یا مارچ ۳۳ء میں واپس آئے۔

(واضح ہو کہ یہ مضمون ۳۳ء میں لکھا تھا اس لیے یہیں ختم ہوگیا۔)

۱۰؎ پہلی ملاقات جنوری ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔

۱۱؎ یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے اب ۱۹۶۹ء میں میری رائے بدل چکی ہے۔

۱۲ ؎ اس مثنوی سے شاعری مقصود نہیں ہے۔ نہ ہی بت پرستی یا بت گری مقصود ہے۔
۱۳ ؎ چونکہ عالم کی حیات زورِ خودی پر موقوف ہے اس لیے زندگی بقدر استواری ہے۔

۱۴ ؎ جب قطرہ خودی کا سبق حفظ یاد کرلیتا ہے تو اپنی بے قیمت ہستی کو موتی میں تبدیل کرلیتا ہے۔
۱۵ ؎ زندگی تو جستجو میں پوشیدہ ہے اور اس کی اصل آرزو میں پوشیدہ ہے۔
۱۶ ؎ دل سوز آرزو سے زندگی حاصل کرتا ہے اور جب وہ زندگی حاصل کرتا ہے تو غیرِ حق فنا ہوجاتا ہے۔
۱۷ ؎ زندہ انسان کو تمنا کی نفی مردہ کردیتی ہے (جس طرح اگر شعلے میں سوز کم ہوجائے تو وہ (آخر کار) افسردہ ہوجاتا ہے۔
۱۸ ؎ علم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی حفاظت کا سامان مہیا کرے اور خودی کی تقویم (پائداری) کے اسباب فراہم کرے۔
۱۹ ؎ خودی محبت سے پائندہ تر، زندہ تر، سوزندہ تر اور تابندہ تر ہوجاتی ہے۔
۲۰ ؎ عشق کو تیغ و خنجر کا خوف نہیں ہوتا کیونکہ اس کی اصل مادی نہیں ہے۔
۲۱ ؎ عشق کی بدولت نجد کی خاک چالاک ہوگئی۔ وجد میں آئی اور آسمان کے اوپر چلی گئی۔
۲۲ ؎ مصطفٰے کا مقام مسلمان کے دل میں ہے اور ہماری آبرو مصطفٰے ہی کے نام سے ہے۔
۲۳ ؎ جنہوں نے دشمنوں پر رحمت کا دروازہ کھولا اور مکے کو لاتثریب (آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا) کا پیغام دیا۔
۲۴ ؎ انہوں نے نسب کے امتیازات کو بالکل فنا کردیا ان کی تعلیم نے اس خس و خاشاک کو بھسم کردیا۔
۲۵ ؎ گلِ صد برگ کی طرح ہماری خوشبو بھی ایک ہی ہے۔ وہی اس نظام کی جان ہیں اور وہ ایک ہیں۔
۲۶ ؎ کیا تو عشق رسول کا مدعی ہے؟ اگر ہے تو پھر محبوب کی تقلید کرکے محکم ہوجاتا۔ تاکہ تیری کمند یزداں کو شکار (گرفتار) کرسکے۔
۲۷ ؎ تاکہ خدائے کعبہ تجھ پر نوازش فرمائے اور تجھے انی جاعلٌ کی شرح بنا دے۔ یعنی خلیفۃ اللہ فی الارض کے مقام پر فائز فرما دے۔
۲۸ ؎ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح اونٹ سے خود نیچے اتر۔ غیر کا احسان اٹھانے سے سو بار اللہ کی پناہ۔
۲۹ ؎ اپنا رزق دوسرے کے دسترخوان سے مت ڈھونڈ۔ آفتاب کے چشمے سے پانی کی موج مت مانگ۔
۳۰۔۳۱ ؎ تاکہ تو پیغمبر کے سامنے اس دن شرمندہ نہ ہو جو بہت روح فرسا ہوگا اس لیے اللہ سے ہمت طلب کر اور دنیا کا مقابلہ کر۔ دستِ سوال دراز کرکے ملت بیضا کی آبرو زائل مت کر۔

۳۲۔ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے اور چاند اس کی انگلی کے اشارے سے پھٹ جاتا ہے۔
۳۳۔ وہ خصوماتِ جہاں میں حکم (پنچ) بن جاتا ہے اور شاہانِ عالم اس کے تابع فرمان ہوجاتے ہیں۔
۳۴۔ بے ہمتی سے صدہا امراض پیدا ہوجاتے ہیں مثلاً کوتاہ دستی، بے دلی اور دوں ہمتی۔
۳۵۔۳۶۔ چونکہ وہ (افلاطون) ذوقِ عمل سے محروم تھا اور اس کی جان وارفتۂ معدوم تھی اس لیے وہ موجودہ

ہنگامے (کائنات خارجی) کا منکر ہوگیا اور اعیانِ نا مشہود کا خالق بن گیا۔
۳۷۔ بہت سی قومیں اس کی شراب سے مسموم ہوگئیں اور سوگئیں اور اس لیے ذوق عمل سے محروم ہوگئیں۔
۳۸۔ اے وہ شخص کہ تیری تھیلی میں شاعری کی نقدی ہے۔ اس شاعری کو زندگی کی کسوٹی پر پرکھ (کہ یہ شاعری سچی ہے یا کھوٹی)
۳۹۔ فکر روشن میں عمل کی طرف رہنما ہوتی ہے جس طرح بجلی کی چمک کڑک سے پہلے ہوتی ہے (اور اس کی طرف رہنما ہوتی ہے)
۴۰۔ تجھے لازم ہے کہ ادب میں فکرِ صالح سے کام لے اور اس کے لیے تجھے عربی شاعری کی طرف مراجعت کرنی پڑے گی۔
۴۱۔ اے غفلت شعار! اطاعت الٰہی کی کوشش کر۔ اختیار، جبر (اطاعت) سے پیدا ہوسکتا ہے۔
۴۲۔ ہر شے کا باطن قانون ہی سے قوی ہوتا ہے تو اس سامان سے کیوں غافل ہے؟
۴۳۔ آئین کی شدت کا شکوہ مت کر اور شریعت کی حدود سے باہر مت نکل۔
۴۴۔ جو شخص خود اپنے نفس پر حکمران نہیں ہے وہ ضرور دوسرے کا محکوم بن جاتا ہے۔
۴۵۔ جب تک لاالٰہ کا عصا تیرے ہاتھ میں ہے تو خوف کے ہر طلسم کو باطل کرتا رہے گا۔
۴۶۔ جو شخص بھی اقلیمِ لا میں آباد ہوگیا وہ عورت اور اولاد دونوں کی قید سے آزاد ہوگیا۔
۴۷۔ وہ ماسوائے اللہ سے قطع نظر کرلیتا ہے (اور) اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دیتا ہے۔
۴۸۔ نائبِ حق تو عالم کی روح کی مانند ہوتا ہے اس کی ہستی (در اصل) اسمِ اعظم کا ظل ہوتی ہے۔
۴۹۔ وہ جزو اور کل (انسان اور خدا) کے رموز سے آگاہ ہوتا ہے اور اللہ کے حکم سے اس جہاں میں قائم ہوتا ہے۔
۵۰۔ وہ نوعِ انسانی کے لیے بشیر و نذیر ہوتا ہے وہ سپاہی بھی ہوتا ہے سپہ گر بھی ہوتا ہے اور امیر (سپہ سالار) بھی ہوتا ہے۔
۵۱۔ وہ "علم الاسماء" کا مدعا اور مقصود ہوتا ہے اور "سبحان الذی اسری" کا بھید ہوتا ہے۔

۵۲۔ اس کی ذات، ذات عالم کی تشریح ہوتی ہے اور اسکے جلال سے عالم کی نجات وابستہ ہوتی ہے۔
۵۳۔ اے تہذیب کہن کے امانت دار! اپنے اجداد کے مسلک سے منحرف نہ ہو۔
۵۴۔ مسلمان کی طبیعت محبت کی بدولت قاہر ہے اور مسلمان اگر عاشق نہیں ہے تو کافر ہے۔
۵۵۔ اس کا دیکھنا اور نہ دیکھنا تابع احکامِ حق ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کا کھانا پینا اور سونا بھی۔
۵۶۔ اپنے ہر عمل سے قربِ حق مقصود رکھ تاکہ تیری ذات سے اس کا جلال آشکار ہو۔

۵۷۔ جو شخص غیر اللہ کی خاطر تلوار کھینچتا ہے (جنگ کرتا ہے) در اصل وہ اپنی تلوار اپنے ہی سینے میں پیوست کرتا ہے۔
۵۸۔ زندگی تو دوسروں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا نام ہے اور اپنے آپ کو بیت الحرم (کعبہ) سمجھنے کا نام ہے۔
۵۹۔ مسلمان کا علم سوزِ دل سے کامل ہوتا ہے کیونکہ اسلام کے معنی ہیں آفل کو ترک کردینا۔
۶۰۔ دانشِ حاضر سے سوزِ عشق مت طلب کرو۔ حق کی کیفیت اس کافر کے جام سے مت مانگو۔
۶۱۔ دانشِ حاضر تو حجاب اکبر ہے۔ بت فروش، بت پرست اور بت تراش ہے۔
۶۲۔ جو اللہ تعالیٰ کے جمال کا عاشق ہے وہی تمام کائنات کا سردار ہے۔
۶۳۔ میں کیا بتاؤں کہ اس شمشیر کا راز کیا ہے؟ اس کی آب زندگی سے اپنا سرمایہ (اپنا وجود) حاصل کرتی ہے۔
۶۴۔ حیدر کا ہاتھ جو کہ خیبر گیر تھا اس کی قوت اسی تلوار سے تھی۔
۶۵۔ تو کہ زمان کی اصل سے آگاہ نہیں ہے (اسی لیے) حیاتِ جاوداں سے آگاہ نہیں ہے۔
۶۶۔ زندگی دہر (زمان) سے ہے اور دہر زندگی سے ہے۔ اسی لیے نبی کا فرمان یہ ہے کہ "لا تسبوا الدھر" یعنی دہر کو برا مت کہو۔
۶۷۔ سازِ وقت نغمۂ خاموش رکھتا ہے اور اگر تو زمان کے راز سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو اپنے دل میں غوطہ لگا۔
۶۸۔ عشق کو شغلِ لا سے آگاہ کر اور الا اللہ کے رمز سے آشنا کر۔
۶۹۔ میں تو تیرے لطف و کرم سے ایک ہمدم کا طالب ہوں جو میری فطرت کے رموز سے آگاہ ہو۔
۷۰۔ تاکہ میں اپنا سوز اس کے دل میں منتقل کرسکوں اور پھر اس کے دل میں اپنا چہرہ دیکھوں۔
۷۱۔ فرد ملت ہی سے احترام حاصل کرتا ہے اور ملت افراد ہی کی بدولت منظم ہوتی ہے۔
۷۲۔ جس شخص نے ملت کے زمزم سے پانی نہیں پیا تو اس کے نغمات کے شعلے اس کے عود (ساز) میں فسردہ (مردہ) ہوکر رہ جائیں گے۔

۷۳۔ انسان کی فطرت آزاد بھی ہے اور مقید بھی ہے اور اس کے جزو میں کل کو گرفت میں لانے کی قوت پوشیدہ ہے۔

۷۴۔ جماعت سے وابستہ رہ کر خودی خود شکن بن جاتی ہے لیکن اس کا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ وہ خودی پھول کی پتی سے ترقی کرکے چمن ہوجاتی ہے۔

۷۵۔ ستاروں کی محفل جذب باہمی پر موقوف ہے اور ایک ستارے کی ہستی دوسرے ستارے کی بدولت محکم ہے۔

۷۶۔ نبی کہتا ہے کہ تو کسی انسان کا بندہ نہیں ہے اور ان بتانِ بے زباں سے کمتر نہیں ہے۔

۷۷۔ تاکہ انہیں ایک اور صرف ایک مقصد پر متحد کرسکتے وہ (نبی) ان کے پاؤں میں قانون کی بیڑیاں ڈال دیتا ہے۔

۷۸۔ انہیں توحید کا نکتہ از سرِ نو سکھاتا ہے۔ نیز تسلیم و رضا کا قانون سکھاتا ہے۔

۷۹۔ خوف اور شک دونوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور عمل کی قوت پیدا ہوجاتی ہے اور اس کی آنکھ کائنات کی مخفی طاقتوں کو دیکھ سکتی ہے۔

۸۰۔ جب عبدہٗ کا مقام محکم ہوجاتا ہے تو (مسلمان کا) بھیک مانگنے کا پیالہ جام جمشید بن جاتا ہے۔

۸۱۔ ملتِ بیضا بمنزلۂ تن ہے اور کلمۂ توحید اس کے حق میں بمنزلۂ روح ہے۔ یہ توحید ہی ہمارے ساز ہستی کے پردوں کو گردش دیتی ہے۔ کلمۂ توحید ہی ہمارے تمام اسرار حیات کا سرمایہ ہے اور اس کا دھاگا ہی ہمارے تمام افکار کا شیرازہ ہے۔

۸۳۔ ملت کا وجود دلوں کی یک رنگی پر موقوف ہے اور یہ کوہ سینا (ملت) ایک ہی جلوے سے منور ہے

۸۴۔ قوم کے افراد کے دماغوں میں ایک ہی تصور ہونا چاہیے اور ان کے دلوں میں ایک ہی مقصود ہونا چاہیے۔

۸۵۔ نسب پر ناز کرنا نادانی ہے کیونکہ اس کا حکم صرف جسم پر نافذ ہے اور جسم فانی ہے۔

۸۶۔ ہماری ملت کی بنیاد کچھ اور ہی ہے اور یہ بنیاد ہمارے دلوں میں پوشیدہ ہے۔

۸۷۔ ہم حضور ﷺ کی تعلیم کی برکت سے بھائی بھائی بن گئے ہیں اور یک زباں، یک دل اور یک جان ہوگئے ہیں۔

۸۸۔ اے مسلمان کہ تو غم کے زندان میں قید ہے اپنے نبی ﷺ سے "لا تحزن ان اللہ معنا" کی تعلیم سیکھ۔

۸۹۔ ایمان کی قوت تیری حیات کو بڑھا سکتی ہے اس لیے تجھے "لاخوف علیہم" کا ورد کرنا چاہیے۔

۹۰۔ غیر اللہ کا خوف، عمل کا دشمن ہے اور زندگی کے قافلے کا رہزن ہے۔

۹۱۔ تیرے قلب میں جو بھی برائی پوشیدہ ہے اگر تو غور کرے تو تجھے معلوم ہوجائے گا کہ اس کی بنیاد غیر اللہ کا

خوف ہے۔
۹۲۔ جس نے بھی آنحضرت کی تعلیم کی روح کو سمجھ لیا ہے اس پر یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ شرک در اصل خوف میں پوشیدہ ہے یعنی جو غیر اللہ سے ڈرتا ہے وہ دراصل مشرک ہے۔
۹۳۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہی ایمان کا عنوان ہے اور کچھ نہیں۔ غیر اللہ کا خوف (غیر اللہ سے ڈرنا) ہی شرک پنہاں ہے اور کچھ نہیں۔
۹۴۔ نبی مسلمان کے قلب و جگر کی قوت بن جاتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ محبوب ہوجاتا ہے۔
۹۵۔ ہم نے دینِ فطرت نبی سے سیکھا اور اس طرح راہِ حق میں ایک شمع روشن کردی۔

۹۶۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، در اصل خدا کا احسان ہے جو اس نے بندوں پر کیا ہے اور یہ عقیدہ پردۂ ناموس مصطفٰے ہے۔
۹۷۔ مسلمان کے دل میں یہ عقیدہ راسخ ہے کہ سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں اور حریت کا عقیدہ اس کی ہستی کا سرمایہ ہے۔
۹۸۔ مسلمان امتیازات کو برداشت نہیں کرسکتا کیونکہ مساوات کا عقیدہ اس کی نہاد (سرشت) میں سما گیا ہے۔
۹۹۔ وہ حق کے لیے خاک اور خون میں لوٹا۔ اس طرح وہ لا الہ کی بنیاد بن گیا۔
۱۰۰۔ مسلمان ما سوی اللہ کا غلام نہیں ہوسکتا اور اس کا سر کسی فرعون کے آگے نہیں جھک سکتا۔
۱۰۱۔ ہم نے قرآن کی رمز حسین سے سیکھی اس کی آگ سے بہت سے شعلے جمع کیے۔
۱۰۲۔ تو مسلم ہے اس لیے اپنا دل کسی خاص اقلیم سے مت لگا اور اس جہان چون و چند میں گم مت ہوجا۔
۱۰۳۔ دل کی دولت حاصل کر کیونکہ یہ جہانِ آب و گل دل کی وسعت میں گم ہوجاتا ہے۔
۱۰۴۔ ہجرت مسلمان کی زندگی کا قانون ہے یہ مسلمان کے ثبات کے اسباب میں سے ہے۔
۱۰۵۔ مچھلی کی طرح سمندر میں آباد ہوجا یعنی قیدِ مکاں سے آزاد ہوجا۔
۱۰۶۔ جو شخص قیدِ مکان سے آزاد ہوگیا وہ آسمان کی طرح کائنات میں آباد ہوگیا۔
۱۰۷۔ جس سیاست نے مذہب کی مسند پر قبضہ کرلیا تو مغرب کے گلشن میں یہ شجر پروان چڑھا۔
۱۰۸۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جسم سے روح نکل گئی صرف جسم باقی رہ گیا آدمیت تو گم ہوگئی صرف اقوام باقی رہ گئیں۔
۱۰۹۔ مسلمان قوم خدا کی نشانیوں میں سے ہے اور اس کی اصل "قالوا بلی" کے ہنگامے سے ہے۔
۱۱۰۔ یہ قوم موت سے بے پروا ہے اور "نحن نزلنا" سے استوار ہے۔
۱۱۱۔ چونکہ خدا نے "ان یطفئوا" فرما دیا ہے اس لیے یہ چراغ بجھ جانے سے محفوظ ہوگیا ہے۔

۱۱۲ ؎ مسلمان کی ہستی صرف آئین پر موقوف ہے۔ نبی کے دین کا باطن صرف یہی ہے اور کچھ نہیں۔
۱۱۳ ؎ قرآن حکیم زندہ کتاب ہے اور اس کی حکمت لازوال اور قدیم ہے۔
۱۱۴ ؎ اس کے الفاظ شک اور تغیر سے پاک ہیں اور اس کی آیات تاویل سے بے نیاز ہیں۔
۱۱۵ ؎ یہ کتاب نوعِ انسان کے لیے پیامِ آخریں ہے اور رحمۃ للعالمین اس کے حامل ہیں۔
۱۱۶ ؎ اے مسلمان تو رسوم میں گرفتار ہوچکا ہے اور کفر کے طریقے حق میں زندان بن گئے ہیں۔
۱۱۷ ؎ تونے "زبر" میں اپنے امر کو قطع کردیا اور تو "الی شیء نکر" کے صحرا میں جادہ پیما ہوگیا۔
۱۱۸ ؎ اگر تو مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا ہے تو یہ ممکن نہیں جب تک تو صرف قرآن کو اپنا رہنما نہیں بنائے گا۔

---

۱۱۹ ؎ اگر تقلید کرنا کوئی نیک طریقہ ہوتا تو پیغمبر بھی اپنے باپ دادا کے مذہب کی تقلید کرتے۔
۱۲۰ ؎ اپنے بزرگوں کی راہ پر چل کیونکہ جمعیت اسی صورت سے حاصل ہوگی۔ تقلید کا مطلب ہے ملت کے قانون کا اتباع۔
۱۲۱ ؎ توحید کا مطلب اپنے دل پر نقش کرلے اور تقلید سے اپنے طرز عمل کو درست کرلے۔
۱۲۲ ؎ انحطاط کے زمانے میں اجتہاد کرنا گویا قوم کی بساط کو لپیٹ دینا ہے۔
۱۲۳ ؎ عالمانِ کم نظر کے اجتہاد سے اسلام کی پیروی کرنا بہتر ہے۔
۱۲۴ ؎ مسلمان یک آئینی سے زندہ ہے اور ملت کا جسم قرآن کی بدولت زندہ ہے۔
۱۲۵ ؎ ہم سب خاک ہیں صرف قرآن دل آگاہ ہے اسے مضبوطی سے تھام لے کیونکہ وہ "اللہ کی رسی" ہے۔
۱۲۶ ؎ کیا تو جانتا ہے کہ اس فرمان کا راز کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ خطروں میں زندگی بسر کرنا ہی حقیقی زندگی ہے۔
۱۲۷ ؎ دینِ مصطفٰے دینِ حیات ہے اور اس کی شریعت آئینِ حیات کی تفسیر ہے۔
۱۲۸ ؎ جب سے مسلمانوں نے شعارِ مصطفٰے کو ترک کردیا اس وقت سے قوم رمزِ بقا سے محروم ہوگئی۔
۱۲۹ ؎ ایک مرید سے کہا کہ اے جانِ پدر! تجھے خیالات عجم سے بچنا لازم ہے۔
۱۳۰ ؎ (کیونکہ) اگرچہ اس کی فکر آسمانوں سے بھی اونچی ہوگئی لیکن دینِ نبی کی حدود سے متجاوز ہوگئی۔
۱۳۱ ؎ اپنے دل کو حرفِ حق (قرآن) سے مضبوط کر، عرب سے موافقت پیدا کرتا کہ تو مسلمان ہوسکے۔
۱۳۲ ؎ اپنی زندگی کا رشتہ ختم الرسل سے مت توڑ۔ نیز اپنے فن اور اپنے قدم پر بھروسا مت کر۔
۱۳۳ ؎ اے مسلمان تو مصطفٰے کی شاخ کا ایک غنچہ ہے اس لیے مصطفٰے کی بادبہاری سے پھول بن جا۔
۱۳۴ ؎ تجھے اسی کی بہار سے رنگ و بو حاصل کرنی چاہیے اور اسی کے خُلق سے کچھ حصہ حاصل کرنا چاہیے۔

۱۳۵ ؎ جس کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہوگیا اس کی رحمت عام ہے اور اس کے اخلاق عظیم ہیں۔
۱۳۶ ؎ اگر تو اس کے مقام سے دور ہے تو پھر ہماری جماعت میں سے نہیں ہے۔
۱۳۷ ؎ امتوں کی پیدائش کا قانون یہی ہے کہ زندگی کسی مرکز پر مجتمع ہوتی ہے۔
۱۳۸ ؎ قوم میں ربط اور نظام مرکز ہی سے پیدا ہوتا ہے اور مرکز ہی سے اس کی زندگی میں دوام پیدا ہوتا ہے۔
۱۳۹ ؎ بیت الحرام (مکہ) ہمارا رازدار بھی ہے اور راز بھی ہے اور بیت الحرام ہمارے لیے سوز بھی ہے اور ساز بھی ہے۔
۱۴۰ ؎ اسی نے ہم کو دنیا میں مشہور کیا اور اسی نے ہمارے حدوث سے قدم (ازلیت) کو وابستہ کردیا۔

---

۱۴۱ ؎ مدعا ہی زندگی کے بقا کا راز ہے اور زندگی کی سیماب صفت قوتوں کو ایک نقطے پر جمع کر سکتا ہے۔
۱۴۲ ؎ جب زندگی کسی مقصد سے آشنا ہوجاتی ہے تو اس عالم کے اسباب کی ضابط ہوجاتی ہے۔
۱۴۳ ؎ مقصود عمل میں مثلِ روح پوشیدہ ہوتا ہے اور ہر عمل اسی سے اپنی کیفیت اور کمیت حاصل کرتا ہے۔
۱۴۴ ؎ چونکہ تیری ہستی کا راز تکبیر (اعلاء کلمۃ اللہ) میں پوشیدہ ہے اس لیے لا الہ الا اللہ کی حفاظت اور اشاعت تیرا فرض منصبی ہے۔
۱۴۵ ؎ جب تک ساری دنیا میں حق کی اشاعت نہ ہوجائے۔ اگر تو مسلمان ہے تو ایک لمحے کے لیے بھی آرام مت کرنا۔
۱۴۶ ؎ ماسوا (کائنات) تسخیر کے لیے ہے اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا سینہ تیرے تیروں کا نشانہ ہے اور کچھ نہیں ہے۔
۱۴۷ ؎ اگر تو غنچہ ہے تو اپنی ذاتی سعی سے چمن تعمیر کر اور اگر تو شبنم ہے تو آفتاب کو مسخر کرلے۔
۱۴۸ ؎ اٹھ اور اپنی مخمور آنکھیں کھول اور اس عالم، مجبور کو بے قیمت اور بے کار مت سمجھ۔
۱۴۹ ؎ اس کا مقصد مسلمان کی ذات کی توسیع ہے اور مسلمان کی ذاتی قوتوں کا امتحان لینا ہے۔
۱۵۰ ؎ اللہ تعالیٰ نے اس جہاں کو نیکوکاروں کے حصے میں دے دیا ہے اور اس کا جلوہ مومن کی آنکھ کے حوالے کردیا ہے۔
۱۵۱ ؎ تو کہ خطاب "انظر" کا مقصود ہے (اللہ نے انسان کو حکم دیا ہے کہ اونٹ کی تخلیق پر غور کرے) اس راستے (حیات دنیوی) کو اندھوں کی طرح کیوں طے کر رہا ہے؟ (کائنات میں غور کیوں نہیں کرتا؟)
۱۵۲ ؎ علم اسماء ہی سے آدم کی اولاد کی عزت ہے اور حکمت اشیا سے آگاہی کی بن پر ہی وہ اپنی حفاظت کرسکتا ہے۔

۱۵۳ ؎ ربط ایام ہمارے لیے بمنزلہ پیرہن ہے اور حفظ روایات کہن اس کے لیے بمنزلہ سوئی ہے۔
۱۵۴ ؎ اے کہ تو اپنے سے بیگانہ ہوچکا ہے۔ بتا تو سہی کہ تاریخ ہے کیا؟ کیا یہ کوئی داستان یا قصہ یا افسانہ ہے؟
۱۵۵ ؎ نہیں بلکہ یہ تجھے تجھ سے آگاہ کرتی ہے۔ تجھے اشنائے کار اور مردِ راہ بناتی ہے۔
۱۵۶ ؎ اگر تو حیاتِ لازوال چاہتا ہے تو اپنے ماضی کا رشتہ حال و مستقبل سے مت توڑ۔
۱۵۷ ؎ وہ جس کے وجود پر کائنات ناز کرتی ہے اس نے عورت کا ذکر خوشبو اور نماز کے ساتھ کیا ہے۔
۱۵۸ ؎ جس مسلمان نے عورت کو کنیز سمجھا وہ قرآنی حکمت سے کوئی حصہ حاصل نہ کرسکا۔
۱۵۹ ؎ اگر تو غور سے دیکھے تو امومت ایک رحمت ہے کیونکہ اس کو نبوت سے ایک نسبت حاصل ہے۔

۱۶۰ ؎ عورت کی شفقت پیغمبر کی شفقت سے مشابہ ہے اور اقوام کی سیرت کی تشکیل کرتی ہے۔
۱۶۱ ؎ اس مقصودِ حرف "کن فکاں" نے فرمایا ہے کہ جنت تو ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔
۱۶۲ ؎ ملت کا وجود ماؤں کی تعظیم پر موقوف ہے ورنہ کارِ زندگی خام ہے۔
۱۶۳ ؎ مائیں رمزِ اخوت کی محافظ ہوتی ہیں۔ اور قرآن اور ملت کے حق میں ان کا وجود باعثِ تقویت ہوتا ہے۔
۱۶۴ ؎ بتول تسلیم کی کھیتی کا حاصل ہے اور ماؤں کے لیے اسوۂ کاملہ ہے۔
۱۶۵ ؎ وہ صبر و رضا کی ادب پروردہ چکی پیستی رہتی تھی اور قرآن کی تلاوت کرتی رہتی تھی۔
۱۶۶ ؎ ہمارا بچہ جب تیرا دودھ پینا چھوڑ دیتا ہے تو سب پہلے تو ہی اسے لا الہ الا اللہ کہنا سکھاتی ہے۔
۱۶۷ ؎ تیری ہی محبت ہمارے اطوار کی تشکیل کرتی ہے اور ہماری گفتار، فکر اور کردار کی تشکیل کرتی ہے۔
۱۶۸ ؎ دورِ حاضر بہت عیار اور مکار ہے اور اس کا کارواں نقدِ دین کے لیے بمنزلۂ رہن ہے۔
۱۶۹ ؎ اس کا ادراک اندھا اور خدا ناشناس (خدا کا منکر) ہے اور کم عقل افراد اس کے پیچاک میں گرفتار ہیں۔
۱۷۰ ؎ اے مسلمان خاتون ! دنیا کے ہنگاموں سے ہوشیار رہ اور اپنے بیٹوں کو اپنی آغوش میں محفوظ کرلے۔
۱۷۱ ؎ ایک ہوجا اور ایک سے موافقت پیدا کر۔ دوئی سے تعلق قطع کرلے۔ اپنی وحدت کو پارہ پارہ مت کر۔
۱۷۲ ؎ ایک ہوجا اور توحید کو دیکھ لے اور اس کے غائب کو اپنے عمل سے موجود کرلے۔
۱۷۳ ؎ عمل میں ایمان کی لذت بڑھ جاتی ہے۔ وہ ایمان مردہ ہے جو عمل میں منتقل نہیں ہوتا۔
۱۷۴ ؎ بندۂ حق بند اسباب نہیں ہوتا۔ زندگانی رہٹ کی گردش نہیں ہے۔
۱۷۵ ؎ تو (چونکہ) مسلمان ہے اس لیے غیر اللہ سے بے نیاز ہوجا اور اہل عالم کے حق میں سراپا خیر و برکت بن جا۔
۱۷۶ ؎ چونکہ راہ بہت دشوار ہے اس لیے کم سے کم سامان اپنے ساتھ رکھ۔ اس دنیا میں آزاد ہوکر زندہ رہ اور

آزادی کی حالت میں رخصت ہو۔
۱۷۷ ؎ کیکاؤس کے تخت پر لات مار دے ۔ سر (گردن) کٹا دے مگر عزت نفس کو ہاتھ سے مت دے۔
۱۷۸ ؎ بے نیازی کیا ہے؟ خدا کی صفت اپنے اندر پیدا کرنا اور غیر کے رنگ کو اپنی شخصیت سے مٹانا۔
۱۷۹ ؎ تو دراصل آفتاب ہے۔ کبھی اپنے اندر تو جھانک۔ دوسروں کے ستاروں سے چمک دمک حاصل مت کر۔
۱۸۰ ؎ باپ، ماں اور چچاؤں (نسبی تعلقات) سے فارغ ہوجا اور سلمان کی طرح اسلام کا فرزند بن جا۔
۱۸۲ ؎ اگر تو نسب کو جزوِ ملت بنا لے گا تو اخوت کے نظام میں رخنہ پڑجائے گا۔

---

۱۸۳ ؎ ہم نے تو محبوبِ حجازی صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کرلیا ہے اسی لیے ہم آپس میں مربوط ہوگئے ہیں۔
۱۸۴ ؎ صرف اس سے محبت ہمارے باہمی تعلق کے لیے کافی ہے اور ہماری آنکھوں کے لیے صرف اس کی شراب کی کیفیت کافی ہے۔
۱۸۵ ؎ عشق جان میں ہوتا ہے جبکہ نسب جسم میں ہوتا ہے اور عشق کا رشتہ نسب سے محکم تر ہوتا ہے۔
۱۸۶ ؎ جو شخص بھی باپ دادا کی قید میں ہے وہ "وہ لم یلد و لم یولد" کے نکتے سے ناواقف ہے۔
۱۸۷ ؎ ہمارا رشتہ "لم یکن" قوی ہوسکتا ہے اور اس صورت میں ہم اقوامِ عالم میں بے مثال ہوسکتے ہیں۔
۱۸۸ ؎ چونکہ خدا کی ذات واحد اور لاشریک ہے۔ اس لیے اس کا بندہ بھی کسی شریک سے موافقت نہیں کر سکتا۔
۱۸۹ ؎ اس کے جسم پر "لاتحزنوا" کا خرقہ ہوتا ہے "انتم الاعلون" کا تاج اس کے سر پر ہوتا ہے۔
۱۹۰ ؎ بندۂ مومن باطل کے سامنے بمنزلۂ تلوار اور حق کے سامنے بمنزلۂ سپر ہوتا ہے اور اس کا امر و نہی خیر و شر کے لیے بمنزلہ معیار ہوتا ہے۔
۱۹۱ ؎ تو قرآن کو ترک کرکے دنیا میں ذلیل و خوار ہوگیا۔ اور اپنی کوتاہ فہمی کی بنا پر گردشِ دوراں کا شکوہ کرنے لگا۔

---

۱۹۲ ؎ اے شبنم کی طرح زمین پر گرنے والے مسلمان ! ! آگاہ ہو کہ قرآن تیری بغل میں ہے جو زندہ کتاب ہے۔
۱۹۳ ؎ میں نے شاعری کی شمع سے محفل آراستہ کی اور قوم کو حیات کا راز بتایا۔
۱۹۴ ؎ اگر میرا دل آئینۂ بے جوہر (سیاہ) اور اگر میرے کلام کوئی تعلیم غیرِ قرآنی ہے۔
۱۹۵ ؎ تو میری فکر کے ناموس کا پردہ چاک کردیجیے اور ملت کے خیاباں کو میرے کانٹوں سے پاک کردیجیے۔
۱۹۶ ؎ نیز قیامت کے دن مجھے خوار اور رسوا کردیجیے اور اپنے پاؤں کے بوسے سے محروم کردیجیے۔

۱۹۷ ؎ بارگاہِ ایزدی میں عرض لیجیے یعنی میرے لیے دعا لیجیے کہ میرا عشق عمل سے ہم آہنگ ہوجائے۔
۱۹۸ ؎ چونکہ میری زندگی اعمالِ صالحہ سے خالی ہے اس لیے مجھے یہ آرزو زیب تو نہیں دیتی (مگر)
۱۹۹ ؎ آپ کی شانِ رحمت تو گیتی نواز ہے (اس لیے) آرزو کرتا ہوں کہ میں حجاز میں وفات پاؤں۔
۲۰۰ ؎ اگر میرے جسم کے اجزاء آپ کے دروازے سے دوبارہ زندہ ہوکر اٹھیں تو اگرچہ میری موجودہ زندگی قابل افسوس ہے مگر آئندہ زندگی قابلِ تحسین ہوجائے گی۔
۲۰۱ ؎ میرے ستارے (مقدر) کو دیدۂ بیدار عطا فرما۔ اور اپنی دیوار کے سائے میں دو گز زمین عطا فرما۔

اقبال اور قرآن

سید نذیر نیاز

انجمن خدام القرآن کے مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں پر قرآن مجید کے کچھ حقوق ہیں۔ ایک اسے ماننا، دوسرا پڑھنا، تیسرا سمجھنا، چوتھا عمل کرنا، پانچواں دوسروں تک پہنچانا، پھر ان پانچوں حقوق کو بعنواناتِ ذیل یوں ترتیب دیا ہے تاکہ ہم سمجھ لیں کہ یہ حقوق فی الواقع ہیں کیا اور باعتبار ان کے ہم کیا فرائض عاید ہوتے ہیں۔ عنوانات یہ ہیں:

۱: ایمان اور تعظیم
۲: تلاوت اور ترتیل
۳: تذکر اور تدبر
۴: حکم اور اقامت
۸: تبلیغ اور تبیین

ایمان اور تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو صدقِ دل سے مانیں۔ ہر حالت میں اس کے ادب اور احترام کا خیال رکھیں۔ نہ کوئی ہستی اللہ تعالیٰ سے زیادہ واجب التعظیم ہے نہ اس کے کلام سے بڑھ کر کوئی اور کلام

واجب تعظیم و تکریم۔

تلاوت و ترتیل سے مراد ہے قرآن مجید کو جملہ آداب ظاہری و باطنی اور لوازمِ تجدید کے ساتھ خوش دلی اور خوش الحانی سے رک رک کر اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا تاکہ اس کی تعلیمات ذہن نشین ہوتی جائیں۔ ہم خلوص نیت سے ان کے اتباع اور پیروی پر آمادہ رہیں۔

تذکر کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا ہر ارشاد بطور ایک حقیقت ذہن میں مستحضر رہے۔ ہم اسے کبھی نہ بھولیں۔ ہر حالت میں اس سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کرتے رہیں۔ تدبر کے معنی ہیں غور اور فکر

اور اس سے مقصود یہ کہ ہم ان حقائق کا فہم اور ادراک پیدا کریں جن کی طرف قرآن مجید نے بکمالِ فصاحت و بلاغت جا بجا اشارہ کیا۔ بالفاظ دیگر آیات الہیہ کا مطالعہ و مشاہدہ جو انفس و آفاق میں بکھری پڑی ہیں۔ جن کا تعلق جہاں انسان اور کائنات سے ہے وہاں زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں سے بھی ہے تاکہ ہم سمجھیں کہ قرآن مجید کی دعوت کیا ہے۔ ہماری غایتِ حیات کیا عالمِ انسانی ہو یا عالم فطرت مشیتِ الہیہ اس میں کس طرح کار فرما ہے۔ ہم اپنی کنہِ ذات تک پہنچیں۔ یہ جان لیں اسے کائنات اور خالق کائنات سے کیا تعلق ہے۔ اس طریق زندگی میں جو ہمارے لیے تجویز ہوا کیا مصلحت ہے۔ یہ بنیادی سوالات ہیں جن پر انسان ہمیشہ سے غور کرتا چلا آیا اور غور کرتا رہے گا۔ لہٰذا قران مجید میں تدبر اور تفکر بھی ایک ایسا عمل ہے جس کی کوئی انتہا ہے نہ اختتام۔

حکم اور اقامت ہے قرآن مجید کے احکام کی منصفانہ پابندی اور ان سب فرائض کی جو اس طرح عائد ہوتے ہیں ہر حالت میں بجا آوری۔ اقامت وہ جدوجہد ہے جو اس نظام اجتماع یا معاشرت کے قیام و استحکام میں لازم ٹھہرتی ہے جو قرآن مجید کا مقصد ہے اور جس کی ابتداء نبی اکرم ﷺ نے اصولا اور عملا ! ہر پہلو اور ہر جہت سے واضح اور مکمل طور پر کردی۔

تبلیغ عبارت ہے تعلیماتِ قرآنی کی ہمہ گیر اشاعت سے کہ ان سے دنیا کا کوئی انسان اور کوئی قوم بے خبر نہ رہے اور تبیین یعنی جیسا بھی موقعہ اور جیسے بھی حالات کا تقاضہ ہے آیاتِ قرآنی کی توضیح و تشریح۔

آئیے اب ڈاکٹر صاحب کے ان ارشادات کے پیش نظر یہ دیکھیں کہ اقبال نے ان حقوق کو کس طرح اور کہاں تک پورا کیا۔

سب سے پہلا فریضہ ایمان اور تعلیم ہے اور اسی سے ایک مسلمان کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اقبال نے قرآن مجید کو ویسے ہی مانا جیسے ہر سچے مسلمان کا فرض ہے وہ صدق دل سے اس پر ایمان لائے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ لفظاً اور معناً حضور رسالت ماب پر نازل ہوا اور بعینہ آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کی تعلیمات عالمگیر ہیں۔ دوامی اور ابدی، جن میں سرِ مو کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔

تعظیم کا یہ عالم تھا کہ جہاں قرآن مجید کا ذکر آیا ان کا سر فرطِ ادب سے جھک گیا۔ چہرہ متغیر ہوگیا۔ بفحوائے {لَوۡ اَنۡزَلۡنَا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ

عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیۡتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡیَۃِ اللّٰہِ ؕ} قرآن مجید کی عظمت کا احساس بڑھتا جاتا۔ کسی گہری فکر میں ڈوب جاتے اس عالم میں ان کی دلی کیفیت کا اندازہ انہیں کے اس شعر سے کیجیے جس میں گویا اسی ارشاد باری تعالی۔ {لَوۡ اَنۡزَلۡنَا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ...} کی ترجمانی نہایت خوبی سے ہوگئی ہے۔

ے آنکہ دوشِ کوہ بارش برنتافت
سطوت او زہرۂ گردوں شگافت

تلاوت کا فریضہ تو اس وقت تک جاری رہا جب تک علالت نے انہیں بے بس نہیں کردیا۔ ان کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا اور قرآن مجید ہی پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ بچپن ہی سے نماز فجر کے بعد علی الصبح قرآن مجید کی تلاوت کرتے ۔ بہ ادب بیٹھ جاتے۔ خوش الحان تھے۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت پر غور کرتے۔ ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھتے تاکہ ہر لفظ اور ہر آیت کے معنی ذہن نشین ہوجائیں۔ قرآن مجید کی تلاوت اور مطالعہ ہی ان کا محبوب ترین اور دل و دماغ کا سرمایہ تھا۔ ان کی غذائے روح ان کے لیے سردرد و ابتہاج کا لازوال سرچشمہ۔ علالت کےہاتھوں دم کشی اور حبس صورت کے باعث جب تلاوت سے معذور ہوگئے تو افسوس فرمایا ع

لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

قرآن مجید سے ان کی شیفتگی اور والہانہ شغف کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی مصروفیت ہو، کیسا بھی انہماک، گھر بار کے معاملات، دنیا کے دھندے ان کا دل ہمیشہ قرآن مجید میں رہتا۔ دورانِ مطالعہ ہی اکثر رقت طاری ہوجاتی۔ بآواز بلند تلاوت کر رہے ہیں تو آواز گلوگیر ہے آنکھیں پرنم۔

تذکر کے لیے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ کوئی گفتگو ہو، تحریر یا تقریر جہاں کوئی بات کہنے کی ہوتی، ان کا ذہن بے اختیار ارشادات قرآنی کی طرف منتقل ہوگیا۔ جہاں کوئی حقیقت سامنے آئی، کوئی فکر ذہن میں ابھرا قرآن مجید کے حوالے سے اس کی وضاحت کردی۔ مثالین بہت ہیں۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، ارض پاک و ہند میں ایک آزاد اسلامی قومیت کی تشکیل کا اولین اعلان تھا۔ اسلامی قومیت کی تشکیل اور وہ بھی صدیوں کے زوال و انحطاط،

فرقہ آرائیوں اور فرقہ بندیوں کے بعد معمولی نصب العین نہیں تھا۔ اسلامی قومیت کے احیاء اور اسلامی قومیت کے قیام میں خطرے ہی خطرے تھے۔ اندرونی اور بیرونی بھی، اس کے لیے شدید جدوجہد، بڑے صبر و استقامت، ایمانِ کامل اور

یقین محکم کی ضرورت تھی۔ یہ ایک آزمائش تھی جس میں قرآن مجید ہی سے تمسک اور قرآن مجید ہی کی رہنمائی سے پورے اترسکتے تھے۔ لہذا اقبال جب سب کچھ کرچکے تو سلسلہ کلام اس ارشاد قرآنی پر ختم کیا۔ {عَلَیۡکُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ ۚ لَا یَضُرُّکُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اہۡتَدَیۡتُمۡ ؕ} ۔ اور ظاہر ہے کہ اس موقعہ پر اس سے زیادہ مناسب تنبیہ اور کیا ہوسکتی تھی کہ اگر ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا حساس ہے، ہم راہ ہدایت پر گامزن ہیں تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ بعینہٖ ۱۹۲۲ء میں جب عالمِ اسلام کا سیاسی اجتماعی زوال اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب کوئی سرزمین نہیں تھی جہاں مسلمان آزادی کا سانس لے سکے۔ جب ان حالات میں اقبال نے خضرِ راہ کے عنوان سے وہ مشہور نظم جو گویا شمع و شاعر کا تتمہ ہے پڑھی تو اس کا خاتمہ بھی اس ارشادِ باری تعالیٰ پر ہوا۔

مسلم استی سینہ راز آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر لا تخلف المیعاد دار

کون مسلمان ہے جو نہیں جانتا کہ یاس کفر ہے۔ قرآن مجید نے اہل یاس کا شمار اصحاب قبور میں کیا ہے اس دور ابتلا میں جب ہر طرف مایوسی ہی مایوسی چھا رہی تھی، لا تخلف المیعاد سے بڑھ کر امید و اعتماد کا پیغام اور کیا ہوسکتا تھا۔

رہا تدبر سو اس باب میں کیا عرض کیا جائے۔ محمد اقبال نے جو کچھ کہا جو کچھ سوچا، جو کچھ لکھا، شعر ہو یا فلسفہ قرآن مجید ہی میں تدبر اور تفکر کی بدولت۔ اس تدبر اور تفکر کی مثالیں پیش کرنا اس کی اہمیت کو کم کرنا ہے۔ یہ تو ایک مستقل موضوع ہے۔ مختصراً یہ کہ اقبال کا سرمایہ فکر قرآن مجید ہی کی تعلیمات تھیں اور کچھ نہیں تھا۔ ان کی شاعری اور افکار کا بغور مطالعہ کیجیے اس میں قرآن مجید ہی کی روح کارفرما ہے اور قرآن مجید ہی کی ترجمانی مقصود۔ اسرار و رموز اور خطبات کے علاوہ کتنی تحریریں ہیں جن کی اساس قرآن مجید ہی کی تعلیمات تھیں اور کچھ نہیں تھا۔ ان کی شاعری اور افکار کا بغور مطالعہ کیجیے اس میں قرآن مجید ہی کی روح کارفرما ہے اور قرآن مجید ہی میں ان کا تدبر اور تفکر ہے۔ پھر یہی تدبر اور تفکر بانگ درا سے لے کر بالِ جبریل، ضرب کلیم،پیام مشرق، زبور عجم، پس چہ باید کرد، مسافر اور ارمغانِ حجاز میں ہر کہیں نمایاں ہے ۔ بلکہ ان کی متفرق تحریریں ،بیانات، تقریریں اور خطوط بھی اس سے خالی نہیں۔ گفتگوؤں میں بات ہر پھر کر قرآن مجید ہی کے معارف اور حکم پر آجاتی۔۔۔ زمانہ طالب

علمی ہی میں جب انہیں قرآن مجید میں تدبر اور تفکر کا سبق دیا جارہا تھا ان کے والد محترم بھی انہیں یہی نصیحت کرتے۔ ایک روز کہنے

لگے قرآن مجید پڑھتے تو ہو اسے سمجھتے بھی ہو۔ یاد رکھو قران مجید پڑھنے ہی سے نہیں دل کے راستے سے بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اسے پڑھو تو یوں سمجھو جیسے قرآن مجید تمہارے دل پر نازل ہورہا ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

اس تدبر اور تفکر اور دل کے راستے سے قرآن مجید کو سمجھنے کی داستان بڑی طویل ہے۔ اس کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ میں پھر دو ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ایک روز کہنے لگے فلسفہ ہو یا سائنس، زندگی اور اس کے مسائل، کوئی عقدہ ہو، حل ہوتا نظر نہ آئے تو قرآن مجید سے رجوع کرتا ہوں۔ آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت شائع ہوا اور اس کے ماتحت یہ ماننا لازم ٹھہرا کہ کائنات اضافہ پذیر ہے تو میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ کئی دن سوچتا رہا بالآخر ایک روز اس پریشانی میں دفعۃً خیال آیا۔ کیوں نہ قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کروں۔ میں نے علی بخش کو پکارا، علی بخش قرآن مجید لے آؤ، علی بخش قرآن مجید لایا اور میں نے اسے کھولا تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب پہلی آیت جس پر میری نگاہ پڑی یہ تھی {واللہ یزید فی الخلق ما یشاء} میں سمجھ گیا۔ میری مشکل حل ہوگئی۔ ایسے نیٹشے کا فوق البشر زیر بحث آیا تو میں نے درخواست کی کہ اس باب میں دانستہ یا نا دانستہ جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں یا کردی گئیں ان کا ازالہ ضروری ہے۔ ناقدین نے فوق البشر کا سلسلہ خواہ مخواہ نائبِ حق سے جوڑ رکھا ہے۔ فرمایا میں تو ان کا کب سے ازالہ کرچکا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے میرے ناقدین اسے غور سے کیوں نہیں پڑھتے۔ میں نے عرض کیا میں انہیں کے خیال سے کچھ ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ان غلط فہمیوں کے پیش نظر چند ایک باتوں کی ایک حد تک وضاحت ہوجائے اور وہ بھی آپ کی طرف سے تو اچھا ہوگا۔ فرمایا اگر تمہارا ایسا ہی خیال ہے تو کل سہ پہر کا وقت مناسب رہے گا۔ ذرا جلدی چلے آنا۔ دوسرے روز حاضر خدمت ہوا۔ اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا تو فرمایا یہ سامنے کی الماری میں قرآن مجید رکھا ہے۔ قرآن مجید اٹھا لاؤ۔ میں اپنے دل میں سمجھ رہا تھا کہ مجھ سے شاید فلسفہ کی بعض کتابوں کی ورق گردانی کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ میں قرآن مجید لے آیا تو ارشاد ہوا۔ سورۃ الحشر کا آخری رکوع نقل کرلو۔ رکوع نقل کرچکا تو پھر چند ایک عنوانات کے ماتحت یکے بعد دیگرے مختصراً کچھ شذرات لکھواتے گئے ۔ یہ دن تھا جب میں پورے طور سے سمجھا کہ اقبال نے نائبِ حق کا جو تصور قائم کیا اس کی اساس

فی الحقیقت کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں تدبر و تفکر کے معنی ہی یہ ہیں کہ علم و حکمت اور فکر و فرہنگ کی ساری دنیا ہمارے سامنے ہو بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ دنیا بتمام و کمال ہمارے سامنے آئے گی تو قرآن مجید ہی کی بدولت۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو قرآن مجید کا رشتہ علم و حکمت سے جس طرح قائم ہے اور علم و حکمت کا قرآن مجید سے اس کا سمجھنا بہت بڑی بات ہے۔ ایک روز گفتگو تھی کہ اس عہد نے جسے سائنس کا عہد کہا جاتا ہے، مذہب کے بارے میں بڑی بدگمانیاں پیدا کردیں بلکہ اس کے خلاف ایک معاندانہ روش اختیار کر رکھی ہے۔ فرمایا یہ اس لیے کہ لوگ علم و حکمت کی صحیح روح سے واقف ہیں نہ قرآن مجید سے کہ اس کی تعلیمات کیا ہیں۔ ارشاد ہوا اور انگریزی میں اسلام خلاصۂ کائنات ہے (EPITOME OF THE UNIVERSE) اور یہی رائے ہمارے علماء کی تھی۔ مگر یہ حقیقت جب ہی منکشف ہوگی جب ہم قرآن مجید میں تدبر اور تفکر سے کام لیں۔ قرآن مجید میں تدبر اور تفکر کیجیے تو علم و حکمت ہو یا کوئی اور صداقت ہمارا رشتہ آپ ہی آپ اس سے قائم ہوجائے گا۔ یہ جو اقبال کے اشعار میں تعلیماتِ قرآنی کی برجستہ اور بے ساختہ ترجمانی ہوتی رہتی تھی تو اسی تدبر اور تفکر کی بدولت۔ ان کا کہنا تھا کہ قرآنِ مجید ہمیشہ کے لیے ہے۔ اس میں تدبر اور تفکر کا عمل بھی ہمیشہ جاری رہنا چاہیے۔

حکم کو لیجیے تو اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اقبال کے نزدیک انسان کے لیے کوئی اساسِ فکر اور اساسِ عمل ہے تو قرآن مجید اور صرف قرآن مجید۔ حکم کے معنی بہت وسیع ہیں۔ یہ ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس سے مراد ہے ان سب اوامر و نواہی کی غیر مشروط پابندی جو ازروئے معروف و منکر اور حرام و حلال شریعت نے ہم پر عائد کیے اور جن کی بجا آوری سے فرد کی سیرت اور جماعت کا کردار اسلام کے سانچے میں ڈھلتا ہے جو ہماری تعلیم و تربیت کا سرچشمہ اور اس عمارت کی اساس ہیں جسے اسلامی نظامِ حیات یا اسلامی طریق زندگی یا اصطلاحاً جو جی چاہے کہہ لیجیے اور جو ساری نوعِ انسانی کو ایک اصول اور قانون پر جمع کرتے ہوئے اس راستے کی طرف لے جاتا ہے جسے اس کی فطرت کہیے جسے خالقِ فطرت نے خود اس کے لیے تجویز کیا۔ مختصراً یہ کہ حکم کا تقاضا ہے اقامتِ دین۔ بالفاظِ دیگر اسلام کی ہر پہلو سے عملاً اور واقعۃً ترجمانی۔ لہٰذا اس معاشرے کی تعمیر جو وحدتِ بشری کی تمہید ہے اور جس کے لیے ایک آزاد اور با اقتدار، مخصوص و متمیز اور جداگانہ سیاسی

اجتماعی گروہ بندی ناگزیر ٹھہرتی ہے، جس کے بغیر ناممکن ہے فرد یا جماعت کی زندگی اسلام کے معیار پر پوری اترے۔ یہی وہ جدوجہد ہے جس میں چراغ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری میں ہمارے ایمان اور صبر و استقامت کا امتحان ہوتا ہے اور جس کا، جب ارض پاک و ہند کی سیاست ایک فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ گئی، وقت آیا اور اقبال نے قوم کو یاد دلایا کہ ہم نہ بھولیں بحیثیت قوم ہمارا فریضہ کیا ہے، ہماری حیاتِ اجتماعیہ اور قومی تشخص کا راز کیا۔ لہٰذا اس مرحلے میں ہمارا موقف کیا ہونا چاہیے تو ان کی مخالفت میں غیروں کی طرف سے جو آواز اٹھی اس میں ایک

حد تک اپنوں نے بھی حصہ لیا۔ حالانکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر اسلام محض ایک عقیدہ نہیں کہ ہم نے اسے مانا اور اپنی ذاتی اور نجی زندگی سے باہر اس پر عمل سے کنارہ کش ہوگئے بلکہ ایک دستورِ حیات جس کے افہام و تفہیم کے لیے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے جو حضور رحمۃ اللعالمین کی بعثت کے ساتھ بطور ایک دین کامل افراد و اقوام کی زندگی لہٰذا امور انسانی میں ہمیشہ کار فرما تھا آج بھی ہے اور رہے گا اگر اس دستورِ حیات کی ترجمانی ایک نظام مدنیت کی شکل نہیں ہوتی۔ اگر اس کی بنا پر ایک ایسی قوم وجود میں نہیں آتی جس کا ضمیر خالص انسانی اور نقطہ نظر لسانی، جغرافی، نسلی عصبیتوں سے بالاتر محض انسانیت پر مرکوز ہے تو کوئی بھی جدوجہد ہو سیاسی یا اجتماعی ذہنی یا اخلاقی اس سے کیا حاصل! یہ ایک سیدھی سادی سی بات تھی جس میں کوئی ایچ پیچ نہیں تھا مگر جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں تھا کہ اگر اسلام ایک عالمگیر دعوت ہے، اگر اس کا خطاب ساری دنیائے انسانی اقوام اور امم سے اور عالم تاریخ سے ہے لہٰذا کسی ایسے نصب العین پر جس سے بحیثیت ایک نوع ہماری تقدیر اور مستقبل وابستہ ہے اور یہی فی الحقیقت تہذیب و تمدن کی اساس۔ اگر مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کردار سے کوئی فریضہ ہے جو عالم بشری کی ہدایت اور خیر و سعادت کے لیے ان پر عائد ہوتا ہے۔ اگر یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے تو ہم اسے آزادی و اقتدار ایک قوم کی حیثیت ہی سے جیسا کہ زبان سیاست میں اس کا مفہوم ہے اور جس کے لیے "خیرِ امت" کی تشکیل ہوئی ادا کرسکتے ہیں۔ نہ اسلامی قومیت کسی دوسری قومیت میں ضم ہوسکتی ہے نہ اس کے دستور حیات میں کسی دوسرے دستورِ حیات کا پیوند لگ سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے ہم اپنا ملی تشخص قائم رکھیں۔ پھر جب اس ملی تشخص کے شعور ہی سے ہماری تعلیم وتربیت میں کچھ معنی پیدا ہوتے اور ہمارا قومی وجود قائم ہے تو حق و باطل

میں شرکت کے کیا معنی:

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

یہ فریضہ ہے جس کی انہوں نے عمر بھر تلقین کی۔ جس کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کردی۔ شعر ہو یا فلسفہ، ادب اور فن یا سیاسی اور ملی زندگی کا کوئی گوشہ وہ جہاں کہیں بھی اور جس حال میں تھے، اسی نصب العین پر قائم رہے اور یہی اول و آخر ان کی آرزو رہی کہ امت اپنے اصل الاصول پر آجائے۔ عصر حاضر کا انسان اپنی سعی و محنت، اپنی عقل و فکر کی تازگی اور علم و ہنر کی نادرہ کاری سے جو دنیا پیدا کر رہا ہے، زندگی نے جو انقلاب انگیز کروٹ لی ہے، ارباب نظر جس نئے اور تابناک مستقبل کا جو خواب دیکھ رہے ہیں مسلمان اس سے غافل نہ رہیں۔ اللہ

تعالیٰ نے انہیں ایک موقع دیا ہے اسی میں ان کا امتحان ہے۔ وہ اٹھیں، اپنے ایمان و یقین کی تجدید کریں اور اس دنیا کی تعمیر میں مصروف ہوجائیں جو اسلام کا مقصود ہے۔ لہٰذا جیسے جیسے دن گزرتے گئے ان کی گفتگو کا کوئی موضوع تھا تو یہی اور یہی ہر ایک سے ان کا کہنا حتی کہ علالت کے آخری ایام میں جب ان کے لیے سانس لینا بھی مشکل ہوگیا تھا ۔ انہیں کوئی خیال تھا تو یہی، کوئی پریشانی تھی تو یہی۔ چنانچہ یہ انہیں کا ایمان و یقین بصیرت اور فراست تھی کہ ارض پاک و ہند کی بساطِ سیاست دیکھتے دیکھتے بدل گئی۔ ع

جہانے را دگرگوں کردیک مردے خود آگاہے

مسلمانوں نے جان لیا ان کے مستقبل کا راز کیا ہے، ان کے لیے صحیح راہ عمل کیا۔

بات طویل ہورہی ہے کہنا یہ ہے کہ اقبال کا کوئی پیغام تھا تو یہی کہ مسلمان سمجھ لیں ان کی زندگی قرآن مجید سے ہے۔ قرآن مجید میں فکر و نظر سے کام لیں۔ اس کی تعلیمات پر عمل کریں۔ قرآن مجید ہی ان کا ایک سرمایہ ہے۔ یہی ان کا پیغام تھا جسے انہوں نے طرح طرح سے پیش کیا۔ شعر میں، فکر میں تحریر و تقریر میں، گفتگوؤں میں، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کوئی معاملہ ہو، کوئی مسئلہ، علم و حکمت کی بحث ہو، تہذیب و تمدن یا ادب اور فن، سیاست اور معاش، فرد کی زندگی، جماعت کے مفاد، انسان، اس کے ضمیر اور باطن، احوال و واردات، امور عالم کی غرضیکہ کوئی موضوع ہو بالآخر قرآن مجید ہی پر ختم ہوتا۔ قرآن مجید ہی نے ان کے فکر کو جلا دی۔ قرآن مجید نے ہی ان کی شاعری

میں وہ کیفیت، وہ درد و سوز اور ذوق و شوق پیدا کیا جس کا سرچشمہ ایمان میں نے عرض کیا تھا۔ ان کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا اور اگر ہم نے اقبال کو سمجھ لیا ہے تو جیسا کہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اس تعلیم کا خاتمہ بھی قرآن مجید ہی پر ہوا۔ آخری عمر میں بھی ان کی کوئی خواہش تھی تو یہی کہ قرآن مجید کے معارف اور حِکَم پر قلم اٹھائیں۔ زندگی کے آخری لمحے آئے تو یہی آرزو کہ قرآن مجید سنیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ جب زندگی ہو یا آخرت اس کا رشتہ قرآن مجید ہی سے وابستہ ہے انہوں نے کہا ہے اور خوب کہا۔

کُرتو می خواہی مسلماں زیستن۔
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

لیکن اس "بقرآن زیستن" کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس جدوجہد میں جو نوع انسانی کو ازل سے درپیش ہے، جس میں تاریخ کی حیثیت ایک لمحے کی ہے، جس میں اقوام و امم یکے بعد دیگرے ایسے ابھرتی ہیں جیسے کسی بہتی ہوئی ندی میں پانی کے بلبلے، جس میں تہذیب و تمدن نے کئی رنگ بدلے، چشم فلک نے کئی انقلاب دیکھے اور جس کا سلسلہ اس لیے جاری ہے اور جاری رہے گا کہ انسان اپنے مدعا و منتہا کو پالے، ہم اس جدوجہد میں مردانہ وار حصہ لیں۔ اسے اسلام کے قالب میں ڈھال دیں۔ یہ مقصد وعظ و نصیحت اور تحریر و تقریر سے حاصل نہیں ہوگا۔ قرآن مجید پر عمل کرنے سے۔

اے کہ می نازی بقرآنِ عظیم
تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن
نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن

یہ اس لیے کہ زندگی کو ثبات ہے۔ اس کی تقویم کا کوئی نسخہ، اس کے امکانات کے حصول کا کوئی راستہ، اس کی غایت اور کنہ میں ادراک کا کوئی ذریعہ ہم سمجھ لیں اس کا رخ فی الحقیقت کس طرف ہے تو قرآن مجید ہی کی بدولت۔ یہی ہماری تعمیر ذات اور یہی ایک ایسی زندہ و پائندہ شخصیت کی اساس ہے جسے موت کا ہاتھ بھی فنا نہیں کرسکتا، قرآن مجید ہی اس حکم اور ترقی پذیر نظامِ تمدن کا صورت گر ہے جس کی ساری نوعِ انسانی کو ضرورت ہے۔ وہ ایک عالمگیر اور ابدی پیامِ ہدایت ہے جو ہمارے لیے مژدۂ حیات لے کر آیا جس میں ہمارا ہی ذکر ہے، جسے یاد رکھنے کے لیے آسان کردیا۔ {وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾} جو عین صداقت ہے، عین علم و حکمت، سرتاسر دستور و قانون، سرتاسر موعظت اور رحمت!

آں کتابِ زندہ قرآن حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخرین حاملِ او رحمۃ للعالمین!

اب اگر ہمیں زندگی کی نعمت ملی ہے، ہمارے نزدیک اس کے کچھ معنی ہیں، ہم اس کی تب و تاب محسوس کرتے، اس کے ذوق و شوق اور سوز و ساز کے لذت آشنا ہیں، ہمارے سینوں میں بھی وہی آرزوئیں اور تمنائیں پرورش پا رہی ہیں، وہی عزائم اور مقاصد ابھر رہے ہیں جن کا تعلق جہاں داری اور جہاں بانی سے ہے، عالمِ محسوس کی تسخیر اور ایک برتر تہذیب و تمدن کے نشوونما سے، ایک ایسی دنیا کا تصور ہیں جو عمل پر اکسا رہا ہے جس میں انسانیت کا جوہر کھلے، جس میں زندگی کو اس کے سارے جمال و جلال کے ساتھ عالم خارج میں مشہور دیکھیں، جس میں نت نئے حقائق اور نت نئے مدارجِ ذات سے لطف اندوز ہوں تو اس میں کامیابی کا رشتہ قرآن مجید ہی سے جوڑنا پڑے گا۔ پھر اس بابت میں اقبال کا خطاب اگرچہ ساری نوع انسانی سے تھا لیکن اس شخص سے بالخصوص جو مسلمان ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے کہ سب سے زیادہ اسی کا فرض ہے کہ اس جدوجہد میں حصہ لے۔

چوں مسلمانانِ اگر داری جگر در ضمیرِ خویش و در قرآن نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عمرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا است
چوں کہف گردد جہانے در برش می دہد قرآں جہانے دیگرش
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جان چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

ہم بھول گئے قرآن مجید ہی سے ہمارا قومی وجود قائم ہے۔ قرآن مجید ہی ہمارے ملی تشخص کا راز، ہمارا آئین، ہمارے لیے اصول و قوانین کا سرچشمہ۔ مگر ہم ذلیل و خوار ہو گئے۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی شکوۂ سنجِ گردشِ دوراں شدی

اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

پھر جس طرح اللہ کے کلمات ختم نہیں ہو سکتے خواہ دنیا بھر کے درخت قلم اور سمندر روشنائی بن جائیں، بعینہ ان کی تشریح و تفسیر تبلیغ و تبیین کا بھی کوئی اختتام ہے نہ انتہا، عقل طرح طرح سے ان کی طرف بڑھے

لی۔ فکر ایک کے بعد دوسرا تصور قائم کرے گا۔ علم پر نئے نئے حقائق منکشف ہوں گے عمل سے کئی ایک عقدوں کی کُرہ کھلتی رہے گی۔ لہٰذا ایک بات ہے جس کا اس ضمن میں سمجھ لینا ضروری ہے جس کی طرف اگرچہ اقبال نے اشارہ بھی کردیا تھامگر جس پر بہت کم توجہ کی گئی اور وہ یہ کہ زندگی چونکہ سرتاسر خلاقی اور تازہ کاری ہے اس لیے تجربے اور مشاہدے کی طرح علم و حکمت اور فکر و وجدان کی دنیا بھی ایک تغیر پذیر دنیا ہے۔ اسی سے اس کی ہستی اور وجود قائم یہی اس کی حرکت اور یہی اس کی طلب اور جستجو کا راز۔ وہ ایک لامتناہی سفر ہے جس میں اگرچہ کوئی مرحلہ اور کوئی ساعت آخری نہیں لیکن جس میں ہم لازماً کسی مقام پر ہوں گے اور اسی مقام سے ماضی و حال کا جائزہ لیتے ہوئے ایک خاص موقف قائم کرتے ہوئے ایک نئی امید اور نئے اعتماد کے ساتھ منتظر رہیں گے کہ ہماری طلب و جستجو سے جو حقائق و اشگاف ہوئے مستقبل میں وہ کس انداز میں ہمارے سامنے آئیں گے۔ بعینہٖ جیسے ایک کوہ پیما ایک بلندی سے دوسری بلندی کی طرف بڑھتا ہے تو اگر وہی مناظر بار بار اس کے سامنے آتے ہیں جن کو وہ اس سے پہلے دیکھ آیا تھا مگر اب ہر لحظہ ایک نئے رنگ میں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ عقل اور فکر کا ہے۔ کہ ہمارے وہ تصورات بھی جن کو ہم آخری اور قطعی سمجھتے ہیں، آخری اور قطعی نہیں ہوتے۔ حقیقت ایک ہے اور لامتناہی۔ جیسے جیسے ہم عقل اور فکر کے سہارے اس کی طرف بڑھیں گے ہمارے وہ تصورات بھی جو قطعی اور یقینی لہٰذا خالی از صداقت نہیں تھے، ایک نئے روپ میں ہمارے سامنے آئیں گے۔ نئے نئے تصورات قائم ہوتے چلے جائیں گے۔ لیکن ایک خاص وقت میں جب حقیقت کا کوئی پہلو اجاگر ہوا اور اس مؤقف کی رعایت سے جو ایک خاص عمر میں عقل اور فکر نے قائم کیا کیونکہ بغیر اس کے کوئی دوسرا موقف ممکن ہی نہیں تھا تو ہم جو کچھ کہیں گے اس مؤقف کا لحاظ رکھتے ہوئے تاکہ اسے دوسروں تک پہنچا سکیں، مگر جس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہوگا کہ ہم نے حقیقت کو موقف یا اس طرح جو تصورات قائم ہوئے ان کے تابع کردیا۔ جس ذہنی فضا میں سانس لے رہے ہیں اس کی برتری

تسلیم کرلی۔ حالانکہ ہم نے جو کچھ کہا محض سہولتِ افہام و تفہیم کے لیے۔ یہاں پھر ایک مثال سے کام لینا بہتر ہوگا جس سے اس امر کی مزید وضاحت ہوجائے گی کہ اقبال کے فکر کی نوعیت فی الحقیقت کیا ہے۔ انہوں نے آیتِ نور "اللہ نور السموات والارض" کے بارے میں جب ایک مغربی مصنف کے خیال کی، جس نے اسے ایک خاص دعوے کی تائید میں پیش کیا تھا تردید کی اور کہا اس آیت کا اشارہ اس حقیقت کی طرف نہیں ہے جو مصنف کے ذہن میں ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں ایک دوسری حقیقت کی طرف تو اعتراض ہوا کہ اقبال نے اس آیت کی جو تاویل کی ہے صحیح نہیں۔ صحیح تاویل کچھ اور ہے جسے میں نے ان کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے اپنے ایک عنایت نامے میں لکھا کہ تاویل تو معترض کر رہا ہے۔ میں نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ مصنف مذکور کے نزدیک اس آیت کا اشارہ جس

حقیقت کی طرف ہے صحیح نہیں۔ میں تاویل کا قائل نہیں ہوں میرا مذہب اس معاملے میں وہی ہے جو ابن حزم کا اور جسے مولانا روم نے اپنے اس ارشاد میں کس خوبی سے ادا کردیا۔

کردۂ تاویل حرفِ بکر را
خویش را تاویل کن نے ذکر را

یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس حرفِ بکر کے معنوں کی ازروئے فکر و تحقیق فلسفہ کی نفی نہیں ہوتی۔ نہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اپنے خیالات کے جواز میں کوئی عقلی حیلہ تراش رہے ہیں۔ مگر بات پھر طول کھینچتی رہی ہے۔ مجھے چاہیے سلسلہ کلام ختم کردوں۔بیان ہے ان حقوق کا جو قرآن مجید کی طرف سے مسلمانوں پر عاید ہوتے اور اقبال کے قرآن مجید میں ایمان و یقین کا ۔ ع

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

بہتر ہوگا میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہ آپ نے میری معروضات توجہ سے سنیں، سلسلہ کلام اقبال ہی کے اس قطعے پر ختم کردوں۔

زِ قرآن پیش خود آئینہ آویز
دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردار خود را
قیامت ہائے پیشین را بر انگیز

(ماخوذ از میثاق جنوری فروری ۱۹۷۴ء)